باسط سلیم صدیقی

# سیج

گوشۂ ادب چوک انارکلی لاہور

# سیج

باسط سلیم صدیقی

گوشۂ ادب ۰ چوک انارکلی لاہور

نومبر ۱۹۵۳ء

بار اوّل
۱۰۰۰

بذریعہ پرمٹ نمبر ۹۴۸
مؤرخہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۳ء

قیمت
تین روپے آٹھ آنہ

(انشا پریس لاہور میں طبع ہوئی)

اپنے مقدّر کے اُس ستارے کے نام
جسے اب تک اپنی منزل
نہیں مِلی

# ترتیب

# آنکھ مچولی

رات آئی —— چاند نکل آیا —— مودی نے حسبِ معمول جلدی جلدی کھانا کھایا۔ پانی کا کٹورہ خالی کر کے الگ رکھ دیا۔ قمیص کی آستین سے منہ اور دامن سے ہاتھ پونچھتا گھر سے باہر نکل بھاگا —— ماں جھنجھتی رہ گئی۔

"بدتمیز —— نالائق —— بے ہودہ، کھانا کھا کر قمیص کی آستین سے منہ پونچھتا ہے۔ جانے کب عقل آئے گی اسے"؟

اور باپ حقّے کی نے منہ سے الگ کرتے ہوئے ہنس کر کہنے لگا۔

"ارے بچہ ہی تو ہے —— بچوں کو عقل سے کیا کام ـ ابھی تو کھیلنے کودنے کی عمر ہے اُس کی۔ بڑا ہوگا تو سب کچھ سیکھ جائیگا۔"

اور ماں دیر تک بڑبڑاتی رہی —— مودی کو کیا معلوم ـ وہ تو محلے میں شور مچا رہا تھا۔

آؤ کھیلیں آنکھ مچولی — تاروں سے بھر لائیں جھولی

ٹومی، بی بی، اختر، نا جو — آؤ ساجد، انور، راجو

ملکر سب بیٹھیں گے اسکو — جسنے آنکھ سے پٹی کھولی

آؤ کھیلیں آنکھ مچولی —

اور پھر چلّا چلّا کر کہنے لگا — آؤ — آؤ — آؤ!

وہ بدستور چلّاتا رہا — محلے میں گھومتا رہا، اور گھروں میں بیٹھے بچے اپنا نام سُن سُن کر بھاگنے کے لئے پَر تولنے لگے — ٹومی نے چند لقمے ہی اٹھائے تھے، کہ مُودی کو پکارتے سُنا، کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا، اور اُٹھنے لگی — ابا نے دیکھا اور ڈانٹ پلا دی — وہ بسورنے لگی۔

"میں اور نہیں کھاتی — بس کھا چکی — اوں — اوں"

ماں نے بچی کو پریشان دیکھا تو بے چین ہو گئی۔

"اے تو کیا ہوا، جانے کیوں نہیں دیتے بچی کو —؟"

اور باپ چلّایا،

"میں نے روکا کب ہے اسے؟ — میں تو کہتا ہوں، اطمینان سے کھانا کھالے، پھر چلی جائے"

ٹومی بدستور بسورتے ہوئے بولی،

"میں اور نہیں کھاتی —— جی نہیں چاہتا — بس۔"

"اچھا تو جا کھیل میری بچی —— جا" — ماں بولی اور پھر میاں سے مخاطب ہوئی۔ "آپ کیا چاہتے ہیں، آپ کی طرح یہ بھی تین چار روٹیاں چٹ کر جایا کرے؟"

میاں چونکے — کچھ جھینپے، کچھ چڑ گئے — کہنا تو بہت کچھ چاہتے تھے۔ مگر پی گئے، اور عینک کو درست کرتے ہوئے، چپکے سے اندر چلے گئے — ٹومی باہر جا چکی تھی۔

ٹوڈی ٹومی کو دیکھ کر خوشی سے چلایا۔

"ٹومی آؤ اور دیکھو سب سے آخر میں کون آتا ہے، جو بھی آیا، آج اُسے ہی چور بنائیں گے۔"

ٹومی نے اتفاق کیا اور پھر دونوں ملکر چلانے لگے۔

آؤ کھیلیں آنکھ مچولی تاروں سے بھر لائیں جھولی

دونوں نے ملکر محلے کو سر پر اٹھا لیا —— اتنے میں ایک طرف سے ساجد بھاگا بھاگا آتا دکھائی دیا — دوسری جانب سے اختر اڑتا چلا آیا — ادھر سے بی بی اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں میں جیبھ دبائے بھاگی بھاگی آ گئی۔

ادھر سے ناجو کھانستا اور راجو پائچے اوپر اٹھاتا ہوا نکلا ـــ سب نے مل کر ہلڑ مچانا شروع کر دیا ـــ انور نے بھی اُن کی آواز سنی اور بھاگا ـــ سب کو دُور ہی سے اُس کے آنے کی خبر ہو گئی، سب چلّائے ـــ "موٹا آگیا ـــ موٹا آگیا ـــ آج موٹا چور بنے گا" ـــ انور ہانپتا کانپتا پہنچا۔ لمبی سانس لی اور سانسیں درست کرتے ہوئے بولا۔

"کیوں میں کیوں چور بنوں گا"

ڈومی بولی۔

"ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ جو بعد میں آئے گا وہی چور بنے گا"۔

انور نہ مانا ـــ راجو آگے بڑھا، اور کہنے لگا۔

"اماں یوں تکرار کرنے سے کیا فائدہ ـــ آج رہنے دو ـــ کل سے جو بعد میں آیا کرے گا وہی چور بنا کرے گا"۔

سب نے یہ فیصلہ منظور کر لیا ـــ مگر پھر سوال اٹھا کہ چور کون بنے؟ ـــ اب کے ساجد آگے بڑھا اور بولا۔

"یہ بھی کوئی مشکل بات ہے۔ ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے"۔

اُس نے سب کو ایک دائرے میں کھڑا کر دیا اور خود کہنے لگا۔

علی بابا چالیس چور — ناچ رہے جنگل میں مور

مور کے پر ہیں رنگ برنگے — پیر مگر ہیں اُس کے گندے

مور کے سر پہ کلغی پیاری — سُن لو سارے بات ہماری

مور گلے میں ڈالے ڈھول — چور بتا ہیں کس کو بول

جُونہی اُس کی بات ختم ہوئی، اُس نے "بول" پر زور دیتے ہوئے ہاتھ کو جھٹکا دے کر پکارا — "ثُومی!"

سارے چلّانے لگے — "ثومی چور — ثومی چور" — ثومی اداس

اداس نظر آنے لگی، اور بولا۔

"مفت میں ہمیں چور بناتے تھے — چور تو ثومی کو بننا تھا"

اور ثومی غصے سے چلّائی،

"موٹا — ریچھ — ہاتھی!"

وہ سوچنے لگی، اگر یہ موٹا اور ساجد نہ جاتا، تو نہ ساجد آگے بڑھ کر پڑھتا، اور نہ اُسے چور بننا پڑتا — مگر اب وہ چور بن چکی تھی — اور راجو پاجامے کو اوپر اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھنے بڑھ رہا تھا۔

ثومی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی — باقی سب چپکے سے ادھر

اُدھر بھاگ گئے ۔ کوئی کسی کونے میں جا دبکا اور کوئی کسی کونے میں جا چھپا ۔ مُودی چوکیدار کے چھپر میں جا گھسا ۔ ثومی اکیلی رہ گئی! ۔ مگر وہ اتنا جانتی تھی، کہ مودی اکثر چوکیدار کے چھپر ہی میں چھپا کرتا ہے ۔ کیونکہ جب کوئی اور لڑکا یا بی بی چور بنا کرتی، تو مودی اور وہ دونوں اُسی چھپر میں چھپا کرتے، اور کوئی انہیں نہ پکڑ سکتا تھا ۔ وہ اپنے بازو دائیں بائیں پھیلائے، ہاتھ ہلاتی، پھونک پھونک کر قدم رکھتی، آہستہ آہستہ چوکیدار کے چھپر کی طرف چلنے لگی ۔ ساجد، راجو اور بی بی چھپر کے قریب سے ہو کر نکلے ۔ مودی نے ان کو آواز دی اور پوچھا "ثومی نے کسی کو چھو لیا ہے یا نہیں؟" جواب نفی میں پا کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد آگے بڑھتے ہوئے ساجد، راجو اور بی بی کو دیکھنے لگا ۔ ثومی چھپر میں گھس چکی تھی ۔!

مودی ثومی کی طرف پشت کئے تھا ۔ وہ آگے دیکھتا اُلٹے پاؤں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا، اور ثومی آنکھوں پر پٹی باندھے بازو بدستور ہوا میں دائیں بائیں پھیلائے، ٹٹولتی ٹٹولتی آگے بڑھ رہی تھی ۔ مودی پیچھے ہٹا ۔ ثومی آگے بڑھی اور دونوں ٹکرا گئے ۔ ثومی سہمی اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی ۔

"ہائے اللہ ۔"

"کون ہے"؟

"ٹومی"

"اوہ میں مودی ہوں، چلو اب کھولو پٹی۔ تُو نے مجھے چھُو لیا اب میں چور بنونگا"

ٹومی کو افسوس ہؤا کہ وہ مودی کو چھونے کیوں چلی آئی۔ اچھا ہوتا جو وہ کسی اور کو چھُو لیتی، اور وہ چور بنتا۔ کیونکہ اگر پھر مودی چور بنا، تو وہ ایک ساتھ کھیل نہ سکیں گے، نہ اکٹھے چھپ سکیں گے، اور نہ بھاگ دوڑ سکیں گے"۔ وہ بولی۔

"ٹھہرو پٹی نہ کھولو، مجھے بتا دو۔ اور کہاں چھپے ہیں۔ میں اُن کو پکڑتی ہوں تم چور نہ بنو۔"

"کیوں؟"

مودی نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔ وہ بولی۔

"اِس لئے پھر ہم دونوں ملکر چھپ نہ سکیں گے۔ چور تم بنا کرو، نہ میں بنا کروں گی، مجھے اِس طرح کھیلنا اچھا نہیں لگتا۔"

مُودی اُس کی پٹّی کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا چاہتا تھا کہ انور ہانپتا ہوا چھپیر میں آن گھسا، اور دیکھتے ہی چلّایا،

"مودی چور۔ مودی چور۔ آؤ سارے۔ ٹومی نے مُودی کو چھُو لیا۔"

ثومی نے بڑھ کر انور کو پکڑ لیا اور چلائی۔

"تم چور بنو گے میں نے تمہیں چھوا ہے۔"

انور دو قدم پیچھے ہٹا اور بولا۔

"پہلے تم نے مودی کو ہاتھ لگایا تھا — مودی چور بنے گا۔"

ثومی پھر اداس ہو گئی اور انور کو غصّے سے دیکھتے ہوئے بولی — موٹا، ریچھ — ہاتھی۔"

انور کا شور سُن کر سارے چھپر کی طرف بھاگے بھاگے آنے لگے۔ بی بی ٹوئے دانتوں میں جیبھ دبائے آئی اور پوچھنے لگی۔

"تون تول بنا ہے۔ موتے تو بنا ہے ہیں؟"

اور انور اکڑ کر کہنے لگا۔

"مجھے کون پکڑ سکتا ہے، مودی چور بنا ہے۔"

کھانسی نے ناجو کے آنے کا اعلان کیا، سب اُدھر مڑے، راجو بھی پائجامہ اوپر کو اٹھاتے ہوئے آرہا تھا اور ساجد آتے ہی بولا — "پٹی کہاں ہے، لاؤ میں باندھوں" — اس نے آگے بڑھ کر مودی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی، اور ایک بار پھر سب کے سب اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

خدا جانے وہ کب تک یوں چلّاتے اور آنکھ مچولی کھیلتے رہتے، اگر بی بی کا باپ اپنی پتلی آواز میں گنگنا کر۔ "بی بی بٹیاں۔ بی بی بٹیاں" نہ پکارتا" اور پھر اُسے ہاتھ سے پکڑ کر گھر نہ لے جاتا۔ بی بی کے ابا کے گنگنانے کی آواز سنکر ٹومی کا ابا عینک درست کرتے باہر نکلا، اور چیخا۔ "ٹومی"۔ ٹومی لرز اٹھی۔ اُس نے سب ساتھیوں کو دیکھا۔ اور پھر بودی کی طرف دیکھنے کے بعد مڑی اور سر جھکا کر چلنے لگی جیسے اُس کا جی نہ چاہتا ہو اور مجبوراً چلی جا رہی ہو۔ ابا کے پاس پہنچتے پہنچتے اُس نے کئی مرتبہ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اب اُس کا ننھا ہاتھ باپ کی مضبوط گرفت میں تھا، اور وہ اُسے گھسیٹے لئے جا رہا تھا۔ بودی کھڑا دیکھتا رہا اور جب ٹومی کے ابا نے دروازہ بند کر دیا، تو وہ بھی اپنے ساتھیوں سے کچھ کہے سنے بغیر، اپنے گھر کی طرف چلدیا۔ انور کہنے لگا،

"تم سب مجھے موٹا کہتے ہو، مگر میرا کمال دیکھو کہ مجھے کوئی بھی نہیں پکڑ سکا، میں ایک بار بھی چور نہیں بنا اور تم سب ایک ایک دو دو بار ضرور چور بنے ہو"۔

اور پھر قہقہے لگانے لگا۔ راجو نے پائجامہ اوپر کو اٹھایا اور بولا،

"اماں تم تو بزدل ہو۔ رام جانے کہاں جا چھپتے ہو۔ چور بننے کے خیال سے ڈر لگتا ہے تمہیں"؟

اور ساجد بولا۔

اِسے معلوم ہے کہ اگر اِس موٹے ہاتھی کی آنکھیں باندھ دی گئیں، تو نالی میں گر پڑے گا۔ پھر اِسے اٹھانے کون آئے گا؟"

ناجو کھانسا اور کہنے لگا۔

"بیٹا ہاتھی کی طرح موٹا ہے' اور باپ بچارہ کانٹی کی طرح دُبلا پتلا اور کمزور' وہ اٹھانے چلا آیا تو ہِلا بھی نہ سکے گا اِسے۔"

خبردار جو میرے باپ کا نام لیا' ڈھیر کر دوں گا۔"

انور چیخا اور دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ محلّے میں شور مچ گیا۔ راجو کا باپ دانتوں میں بیڑی دبائے بازار سے چلا آرہا تھا۔ بچّوں کو لڑتے جھگڑتے دیکھا تو چلّایا۔

"اماں راجو کیا کر رہیا ہے تو' چل گھر چل۔"

راجو نے جیسے باپ کی آواز سُنی ہی نہ تھی۔ وہ بدستور پاجامہ اوپر کو اٹھاتے ہوئے انور اور ناجو کے جھگڑنے کا تماشہ دیکھ رہا تھا' اُس کا باپ پھر چیخا۔

اماں سنتا ہی نہیں۔ ۔اے راجو کے بچے' سنتا نہیں' میں بلا رہیا ہوں' چل گھر۔"

اور پھر انور، ساجد اور راجو کو دیکھ کر بولا۔

"اماں لڑتے کیوں ہو۔ جاؤ اپنے اپنے گھر"۔

انور غراتا گھورتا ہوا مڑا اور گھر کی طرف چلدیا! تھوڑی دیر بعد محلے میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بوڑھا چوکیدار داڑھی کھجاتے ہوئے، ہاتھ میں ڈنڈا لئے چاند کی روشنی میں پھرتا نظر آرہا تھا۔

گرمی کا موسم ختم ہوا۔ آنکھ مچولی بھی ختم ہو گئی۔ سردی آئی اور گذر گئی۔ پھر گرمی کا موسم آیا اور آنکھ مچولی کھیلی جانے لگی۔ اب کے بی بی کے دانت ٹوٹے ہوئے نہیں تھے۔ اور وہ تو تلا کر نہیں بولتی تھی۔ انور پہلے سا موٹا نہیں رہا تھا۔ ایک سال کے عرصے میں کچھ پڑھائی، کچھ ماسٹر کی پٹائی، اور کچھ عمر بڑھ جانے کی وجہ سے اُس کے بدن میں پھرتی آگئی تھی۔ اور اب وہ ڈھیلا ڈھالا انور نہیں رہا تھا۔ راجو کی عادت ہنوز نہیں بدلی تھی۔ وہ پہلے کی طرح پائجامہ اوپر کرنے کی عادت نہ بھولا تھا، البتہ راجو کھانستا نہیں تھا۔ مودی اور ٹومی پہلے کی طرح اب بھی چور بننا پسند نہیں کرتے تھے۔ گرمی آنکھ مچولی کھیلتے گذر گئی! پھر سردی آئی۔ اور آنکھ مچولی کھیلنے کا موسم ختم ہو گیا۔ سال پر سال گذر گئے۔ اب وہ خاصے سیانے ہو چکے تھے:

ثومی آنکھوں پر پٹی باندھے، بازو دائیں بائیں پھیلائے ٹٹولتی ٹٹولتی آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ کسی سے ٹکرائی، سہمی اور اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"ہائے اللہ"

"کون ہے"؟

"ثومی"

"اری تو ہے، کیا کر رہی ہے"؟

ثومی نے گھبرا کر آنکھوں سے پٹی کھول دی۔ اُس کے دادا جان ہاتھ میں لاٹھی لئے کھڑے تھے۔

"ہم آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں دادا جان"

ثومی نے جواب دیا اور دادا جان کڑک کر بولے "چل گھر" ——— خود لاٹھی ٹیکتے "اللہ ہو" کا ورد کرتے آگے آگے چلے اور ثومی سر جھکائے پیچھے پیچھے۔ جیسے اُس کا جی نہ چاہتا ہو اور مجبوراً اُس کے قدم آگے اٹھ رہے ہوں اُس نے کئی بار مڑ مڑ کر دیکھا۔ مودی خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وقت زیادہ گذر چکا تھا، بی بی کا باپ باہر نکلا اور گنگنایا

"بی بی مٹیاں" — بی بی بٹیاں" — بی بی چلی گئی" — راجو کو اس کے باپ نے بازار سے آتے ہوئے بلایا" —

"اماں اب تک کھیل رہا ہے تو — چل گھر"

راجو کھسکا — ساجد گیا — انور اختر اور ناجو بھی چلے گئے — محلے میں خاموشی چھا گئی اور بوڑھا چوکیدار داڑھی کھجاتے ہوئے محلے میں گھومتا نظر آنے لگا!

رات آئی — چاند نکل آیا — مودی نے حسب معمول جلدی جلدی کھانا کھایا پانی کا گلاس خالی کیا — رومال سے ہاتھ منہ پونچھا، اور باہر نکل بھاگا — ماں خاموش تھی — اور باپ کتاب سے نظریں اٹھا کر حقے کی نے منہ سے الگ کرتے ہنسا اور بولا۔

"دیکھا، میں نہ کہتا تھا، سب کچھ سیکھ جائیگا — بچہ ہے شدہ شدہ اس کی سب عادتیں بدل جائیں گی"

ماں خاموشی سے چھوٹے بچے ہمایوں کو چوری کھلانے لگی، اور باپ نے پھر کتاب پر نظریں جما حقے کی نے ہونٹوں سے لگائی — مودی کو کیا معلوم — وہ تو محلے میں شور مچا رہا تھا۔

آؤ کھیلیں، آنکھ مچولی — تاروں سے بھر لائیں جھولی

مودی کی آواز سُنکر بی بی آئی، ساجد آیا۔ انور راجو اور ناجو آئے۔ اختر چلا آیا۔ مگر ٹومی نہ آئی۔ مودی چلاّتا رہا۔ بی بی بولی۔

"اب چپ بھی ہو جاؤ۔ اور کون آئیگا جو چلاّ رہے ہو؟"

"واہ ٹومی تو ابھی آئی ہی نہیں۔"

مودی بولا۔ اور بی بی کہنے لگی۔

"اب وہ نہیں آیا کرے گی۔ آؤ ہم کھیلیں۔"

علی بابا چالیس چور۔ ناچ رہے جنگل میں مور

مور کے پر ہیں رنگ برنگے ............

ماں مودی سے پوچھ رہی تھی۔

"چپلے کیوں آئے۔ آج آنکھ مچولی نہیں کھیلو گے؟"

جواب میں مودی نے ماں سے پوچھ ڈالا۔

"اماں ٹومی کھیلنے کیوں نہیں آیا کرے گی؟"

ماں کے دل پر گھونسہ لگا؛ وہ پل بھر کے لئے کسی گہری فکر میں ڈوبی، اُبھری اور بولی۔

"اُس کے دادا جان نے اُسے منع کر دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اب وہ بڑی ہوگئی ہے۔ اُسکے دادا جان پُرانی وضع کے آدمی ہیں اور پردے کے بہت پابند ہیں۔ انہوں نے ثومی کے ابّا کو بھی ڈانٹا کہ ابھی تک اُسے پردے میں کیوں نہیں بٹھایا گیا؟"

ماں نے جواب دیا۔ اور مودی خاموشی سے مُڑا۔ ماں نے دیکھا اور بولی۔

"تم جاؤ، کھیلو جاکر۔"

"نہیں اماں، جی نہیں چاہتا۔ اب میں بھی نہیں کھیلا کروں گا۔"

وہ چپ چاپ اپنے بستر پر جا لیٹا۔۔۔ ماں کو ایسی فکر لاحق ہوگئی جس سے اُسے اُٹھتے بیٹھتے کسی وقت بھی نجات نہ مل سکتی تھی۔۔ گلی میں سب ملکر شور مچا رہے تھے۔ کھیل رہے تھے، ہنس رہے تھے، اور ثومی اُن سب کی آواز سن رہی تھی۔ اُسے مودی کی آواز سنائی نہ دی۔ اُس نے لمبی سانس لی۔ جانے اُسکا ننھا سا دل کیا سوچ رہا تھا!

مودی ثومی کو نہ دیکھ سکتا تھا، ثومی برقع میں اسکول میں آنے جانے لگی۔ اور چھوٹی عمر ہی میں مودی کی شوخی شرارت سنجیدگی میں بدلنے لگی۔ دو سال بعد وہ ہنسوڑا مودی نہیں رہا تھا۔ بلکہ بڑا خاموش اور سنجیدہ ہو چکا تھا۔ اُسکی خاموشی لو

سنجیدگی اُس کی ماں کے لئے دُکھ باعث بنتی جارہی تھی، مگر باپ خوش تھا کہ مودی بڑا سمجھدار اور ہوش مند نوجوان بن رہا ہے —— جوں جوں دن گذر رہے تھے ماں کی فکر دوچند ہوتی جارہی تھی۔ اور وہ اکثر سوچا کرتی، کہ اگر محمود کلثوم سے شادی کرنے پر اڑ گیا، تو یقیناً باپ بیٹے میں بدمزگی پیدا ہو جائیگی۔ کیونکہ اس کا ابّا اُس کے مستقبل کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے آپ ہی آپ بڑبڑایا کرتی۔ مگر اُس نے ایسی کوئی بات مودی پہ ظاہر نہ ہونے دی۔ ایک سال اور گذر گیا۔

مودی دسویں میں پڑھ رہا تھا؛ اُس کی مسیں بھیگ چکی تھیں، اور اب وہ نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ اُس کی بھُوری آنکھوں میں اکثر بے خوابیاں اور اُداسیاں جھانکتی نظر آتی تھیں۔ جن سے وہ اور بھی پیارا نظر آتا تھا۔ مگر بھرے ہوئے خوبصورت چہرے پر ایسے کوئی آثار نہیں تھے جو اُس کے جذبات کی ترجمانی کر سکتے۔ اور پردہ نشیں ٹونی، شبنموں کی گود میں پلنے والے اُس پھول کی طرح پروان چڑھ رہی تھی۔ جس میں بہاریں آکر، نزاکتیں، لطافتیں، نکھتیں، بانکپن اور مستیاں بھر جاتی ہیں، اور اُس کا نکھار آنکھ کے لئے تماشہ بن جاتا ہے!

مودی کھانا کھانے بیٹھا، اور آٹھ سال کا ننھا ہمایوں جلدی جلدی کھانا

کھاکر باہر نکل گیا۔ کسی کو پتہ نہ چلا۔ مودی کھانا کھا رہا تھا۔ اور ہمایوں محلے میں شور مچا رہا تھا۔

آؤ کھیلیں آنکھ مچولی — تاروں سے بھر لائیں جھولی
اشرف، اکبر، قاسم، نند — آؤ تلسی، راجہ، چندو
مل کر سب بیٹھیں گے اُس کو — جس نے آنکھ سے پٹی کھولی
آؤ کھیلیں آنکھ مچولی ـــــ

اور پھر زور زور سے چلانے لگا۔ آؤ ـــ آؤ ـــ آؤ!

محلے میں بچوں کا شور بڑھنے لگا۔ مودی نے چاہا کہ کھانے سے ہاتھ کھینچ لے، رومال سے منہ پونچھے، اور آنکھ مچولی کھیلنے بھاگ جائے۔ اُس کے ہاتھ رُک سے گئے۔ آنکھیں ایک جگہ جم کر رہ گئیں۔ "اُسے اور اس کے ساتھیوں کو نہیں پکارا جا رہا تھا" ورنہ ٹومی کا نام تو سب سے پہلے لیا جاتا؛ اور پھر اپنے ساتھیوں کو پکارنے والا اُس کے سوا اور کون ہوتا؟" ـــ ماں خاموشی سے مودی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ مودی کی نظریں ماں کی نظروں سے ٹکرائیں، اور جھک گئیں ـــــ!

دوسرے دن مودی کی ماں ٹومی کی ماں کے پاس بیٹھی تھی، اور کہہ رہی تھی۔

"کلثوم خیر سے سیانی ہو گئی ہے، دیکھو تو کتنا شرماتی ہے، میرے سامنے آتے ہوئے بھی حجاب آنے لگا ہے اسے، مجھے دیکھا اور فوراً اندر بھاگ گئی۔"

اور ثومی کی ماں آہ بھر کر بولی۔

"ہاں بہن کلثوم خیر سے سیانی ہو گئی ہے۔ مگر اس کا چلبلا پن اب تک نہیں گیا۔ جانے کیا بات ہے۔ اکثر کھوئی کھوئی سی رہتی ہے اور رات کو جب بچے محلے میں آنکھ مچولی کھیلنے نکلتے ہیں، اس کا جی بھی یہی چاہتا ہے کہ گھر سے نکل بھاگے جس طرح بچپن میں اللہ رکھے محمود چلایا کرتا تھا، اور یہ کھانا چھوڑ کر ایک دم بھاگ جایا کرتی تھی۔"

مودی کی ماں بولی۔

"محمود کی بھی یہی حالت ہے، کل رات جب ہمایوں باہر گیا اور چلّانے لگا۔ "آؤ کھیلیں آنکھ مچولی"۔ تو اس نے فوراً کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور چاہا کہ باہر بھاگ جائے، مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو رہا۔"

دونوں ایسی ہی باتیں کرتی رہیں اور ثومی پردے سے لگی سُنا کی، اُسے محمود سے ملے کئی سال گذر چکے تھے۔ "کہاں بچپن کی سادگی آزادی اور کہاں جوانی کی پابندی!"

باتوں باتوں میں مودی کی ماں سب کچھ جان گئی کہ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے
اور یہ لطیف احساس ایسا ہے، کہ اسے جس قدر دبایا جائے اُسی قدر اُبھرتا ہے،
پھر اُسے یہ بھی معلوم تھا، کہ مودی کا اباؔ اُس کے مستقبل کا اور ٹومی کے والدین بیٹی
کے مستقبل کا فیصلہ کر چکے ہیں، اس لئے اُس نے مودی کو سمجھانا یا اُس سے اِس
معاملے میں کچھ پوچھنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ عورت سمجھدار تھی۔ خاموش ہو رہی۔
البتہ اُس نے بیٹے کی حرکات پر کڑی نگرانی رکھنا شروع کر دی اور اُسکی حالت
کا بغور مطالعہ کرنے لگی —— اب مودی کے امتحان قریب آرہے تھے۔

مودی دسویں میں کامیاب ہوگیا، آج اُس کی ماں کی خوشیوں کی انتہا نہ تھی۔
مگر خوشیوں کے اِس ہجوم میں ایک نہایت پیچیدہ سوال اُبھر ابھر کر اُسے خوفزدہ
کئے جا رہا تھا۔ جب وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہونے لگتی، اچانک اُسی حالت میں
ایک دم ایسی صورت بنا لیتی، جیسے اُسے ہنسے مسکرائے مدتیں گزر چکی ہوں، بیٹے
کی اتنی بڑی کامیابی کے موقع پر بھی اُسے سکون اور اطمینان حاصل نہیں تھا۔!

مودی محلے میں گذر رہا تھا، کہ عقب سے اُسے کسی نے پکارا، اُس نے مُڑ کر
دیکھا، پکارنے والا راجو تھا!

راجو پائجامہ نہیں، میلی سی خاکی پتلون پہنے تھا، لیکن پتلون کو اوپر اٹھانے

کی عادت اب بھی وہی تھی، دو سال ہوئے اُس کے باپ کے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں مشین میں آکر کٹ گئی تھیں۔ کارخانے کے مالک سیٹھ چھجو رام نے اُسے کارخانے کا پرانا ہوشیار اور محنتی مستری ہونے کی وجہ سے تیس روپیہ ماہوار پنشن دیکر اُس کی جگہ اُس کے نوعمر بیٹے راجپال (راجو) کو ملازمت دیدی تھی۔ اب راجو، دو سال بعد ترقی کر کے باپ کی جگہ مستری کا کام کر رہا تھا۔ اُس نے بیڑی کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"اماں یار مودی دکھائی ہی نہیں پڑتے تم تو؟ سُنا ہے انٹرنس میں کامیاب ہو گئے ہو، مبارک ہو!"

"خوش رہو دوست" — مودی نے جواب دیا۔ اور راجو بولا۔

"میں ابھی کارخانے سے آ رہا ہوں، اپنی قسمت میں تو آٹھویں سے آگے پڑھنا لکھا ہی نہیں تھا، ورنہ آج ہم بھی دسویں پاس کر لیتے، ہلئے ہائے۔"

اُس نے بیڑی کا کش لگایا، اور پتلون کو اوپر کرتے ہوئے پھر بولا۔

"ناجو کہہ رہا تھا انور فیل ہو گیا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں"

مودی نے مختصر سا جواب دیا، راجو ہنسنے لگا۔ اور بولا۔

"اماں وہ تو شروع ہی سے بڑا بدھو تھا۔ کیا تمہیں بچپن کے وہ دن یاد نہیں جب ہم آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے اور وہ چور بننے سے ڈرا کرتا تھا، پرلے درجے کا کام چور بھی تھا۔ اور پھر ماں باپ کا لاڈلا بیٹا۔ لاڈلے بیٹوں کا انجام عام طور پر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔"

راجو نے بچپن کو آواز دی، اور مودی کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ راجو سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا، اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ آج گھر بھی نہ جائے، اسے آج تنہائی کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر گھر میں تو خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور اس کا باپ اپنے دوستوں سے اس کی ملاقات بھی کرا چکا تھا، اور خدا جانے وہ کتنے اور دوستوں کو دکھایا جانے والا تھا، اس نے راجو سے کہا۔

"تم کارخانے سے آرہے ہو، تھک چکے ہو گے، جاؤ جا کر آرام کرو۔"

راجو نے بیڑی پھینکتے ہوئے کہا۔

"اماں روز کا دھندہ ہے، آج تھک ہار کر بیٹھ رہے تو کل ہمت نہیں پڑے گی۔ اچھا پھر ملیں گے۔"

وہ جانے کو مڑا، اور مودی چوکیدار کے چھپر کی طرف بڑھنے لگا۔ وہاں پہنچ کر اس نے جانے کیا کیا سوچا، پھر اسے خیال آیا کہ ٹومی نے سنا ہوگا کہ وہ دسویں

کامیاب ہو گیا ہے، تو وہ کس قدر خوش ہوئی ہوگی"۔ وہ وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا اور یہ سوچکر گھر کی طرف چلدیا، کہ تنہائی اس کے لئے اچھی نہیں ہے۔

ہمایوں مودی کو ادھر اُدھر دیکھتا اُس کے کمرے میں آن گھُسا، اور آہستہ آہستہ اُس کے قریب پہنچکر دھیرے سے جیب سے ایک نیلے رنگ کا لفافہ نکالکر اُس کو دیتے ہوئے بولا۔

"بھائی جان ثومی آپا نے دیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا، دیکھنا کسی سے کہنا نہیں"۔ آپ بھی کسی سے نہ کہئے گا"۔

اور وہ جلدی سے کمرہ چھوڑ گیا۔ مودی نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا!۔ "ایک ننھا سا سفید رنگ کا ریشمی رومال جس کے کونے میں "آنکھ مچولی" کڑھا ہوا تھا، اور ایک کاغذ کا پرزہ جس پر لکھا تھا —— "مودی تمہیں کامیابی مبارک ہو میں بہت خوش ہوں"۔ —— ثومی"۔

اُس کی اداس آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ ساری دنیا کے خلاف بغاوت کر دے کہ اُس نے اُن دونوں کے درمیان دیوار حائل کر رکھی ہے"۔

آج اُس کے بھرے خوبصورت چہرے پر انتہائی غم کے آثار بھی نمودار ہو رہے تھے۔ اُس کا جی بے اختیار رونے کو چاہا۔

"مودی"

وہ چونک اُٹھا، اُس کی ماں کمرے میں داخل ہو کر اُس کے قریب پہنچ چکی تھی، اور اسے اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ وہ رومال اور کاغذ کے پُرزے کو چھپا سکتا:

"کیا لکھا ہے ثومی نے مودی؟"

مودی بوکھلا سا گیا، کہ اماں سے کس نے کہہ دیا ہے۔ ماں پھر بولی۔

"ہمایوں میرے پاس آیا اور کہنے لگا: اماں اماں ثومی آپا نے مجھے ایک لفافہ دیا اور کہا یہ اپنے مودی بھیا کو دیدینا، اور دیکھنا کسی سے کہنا نہیں: اماں میں نے وہ لفافہ بھائی جان کو دیدیا ہے اور اُن سے بھی کہہ دیا ہے، کہ وہ کسی سے نہ کہیں، آپ بھی کسی سے نہ کہئے گا: میں نے اُسے ڈانٹا کہ خبردار کسی اور سے نہ کہنا ورنہ گھر سے نکال دوں گی تجھے، وہ سہم کر چپکا ہو رہا، پھر چلا گیا۔"

مودی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ماں نے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے دیکھے تو سمجھ گئی کہ ندی چڑھی ہوئی ہے۔ پانی کناروں سے چھلک گیا تو سیلاب آجائے گا۔ اُس نے اچٹتی نظر سے رومال اور کاغذ کا پرزہ دیکھا، اور بات کا رُخ بدل کر کہنے لگی؛

"بڑی اچھی لڑکی ہے ثومی؛ مبارکباد لکھ بھیجی ہوگی۔ بیٹا اب تو بی ا ے

پاس کر لے۔ پھر تیرا بیاہ رچاؤں۔"

اور جواب سنے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ مودی سوچ میں پڑ گیا۔ "ثومی بڑی اچھی لڑکی ہے۔ 'تو بی اے پاس کر لے تو تیرا بیاہ رچاؤں' — بیاہ — ثومی سے ؟" — اُس نے ریت کے محل بنانا شروع کر دیئے۔

مودی سمجھا اب منزل دُور نہیں، دو گام چلنے کی ہمت پیدا کرنی چاہیئے۔ اُس نے اُسی رومال میں اپنے آنسو جذب کر دیئے اور اپنا پہلا فیصلہ منسوخ کر کے الیف' اے میں داخلہ لینے کا پکا ارادہ کر لیا۔ ماں اُس کی اچانک تبدیلی پر حیران تھی۔؟

ثومی کے ابا جب بھی مودی کے ابا کے پاس آ کر بیٹھتے، کاروبار ہی کے متعلق باتیں کیا کرتے، اور مودی کبھی کبھی اُس طرف سے ہو کر گذرتا۔ جیسے اُس کو اُن کی باتوں میں کسی اور پہلو کی تلاش ہو۔ مگر اُس نے ثومی کے ابا کو ہمیشہ یہی کہتے سنا۔ کہ جنگ کے اثر نے تجارت کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ وہ لوگ جو چور بازاری کرتے ہیں رئیس بن گئے ہیں، مگر چور بازاری نہ کرنے والا تاجر طبقہ بالکل تباہ ہو گیا ہے۔"

— ثومی کے ابا کے اندیشے اور پریشانیاں دن بدن بڑھتی ہی جا رہی

# زعفران کے پھول

کرشن چندر کے نام

# زعفران کے پھول

آؤ، مسافر، یہاں! اس چنار کے سائے میں بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی پانی پلاتی ہوں ... ... وہ نیلی نیلی لمبی سی موٹر ہے نا تمھاری؟ ... ... پنکچر ہو گیا ہے؟ ... ... کوئی بات نہیں اندھیرا ہونے سے پہلے سری نگر پہنچ جاؤ گے ... ... اب بیس کوس کی تو بات ہی ہے ... ... نہیں بیٹا مجھے پانی کی قیمت نہیں چاہیے۔ اور پھر پیسے لے کر کروں گی بھی کیا۔ میرا ہے ہی کون؟ ... ... اکیلی جان ہوں، ذیلدار کے کھیت میں کام کرتی ہوں، چشمے سے پانی بھر لاتی ہوں، دھان کوٹ دیتی ہوں، اللہ کا شکر ہے مٹھی بھر چاول تو مل ہی جاتا ہے۔ پانچ اوپر ساٹھ عمر ہونے کو آئی۔ اور چاہیے ہی کیا ایک بڑھیا کو۔ آج مری کل دوسرا دن ... ... تم بھی کہتے ہو گے کس بکواسن سے پالا پڑ گیا ہے ... ...

کیا کہا تم نے، بیٹا؟ ... ... نہیں نہیں گل لالہ کا نہیں یہ زعفران کا کھیت ہے ... ... ٹھیک کہتے ہو زعفران کے پھول سچ مچ کاسنی ہی ہوتے ہیں۔ ابھی آگے جاؤ گے تو دوسرے کھیتوں میں کاسنی پھول ہی پاؤ گے۔ پھر

یہاں اس سال زعفران کے سرخ پھول ہی کھلے ہیں ... ... اس کی وجہ کیا ہے؟ ... ... یہ خدا کی قدرت ہے بیٹا۔ پر تم میدانوں کے رہنے والے آج کل کے نوجوان، خدا اور اس کے کرشموں کو کب مانتے ہو۔ ہم کشمیریوں کو وہمی اور بے وقوف سمجھتے ہو کہ ہم ایسی باتوں میں اعتقاد رکھتے ہیں ... ...

اب ان پھولوں کی پوری کہانی سن کر کیا کرو گے؟ ... ... ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم چلے جاؤ گے اور کہانی ادھوری رہ جائے گی ... ... موٹریں تو اس سڑک پہ گزرتی رہتی ہیں، بیٹا! پل دو پل کو ٹھیرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں۔ پر یہ زعفران کی کھیتی، یوں ہی کھڑی رہے گی۔ یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو بھیج دیئے جائیں گے، اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوانوں پر مہکے گی۔ اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے ... اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح سرخ کیوں ہے؟ ... ... پر کوئی نہ بتا پائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں۔

تم مجھے پاگل سمجھتے ہو نا؟ ... ... دیوانی بڑھیا جو نہ جانے کیا کیا بک رہی ہے ... ... ہے نا؟ ... ... پھر بھی اس لال زعفران کا بھید جاننا چاہتے ہو؟ ... ... یا ابھی تمہاری موٹر درست ہونے میں دیر ہے اور تم اس وقت کو ایک پگلی کی بڑ سن کر ہی کاٹنا چاہتے ہو؟ ... ... خیر جو بھی ہو۔ سننا چاہتے ہو تو سنو ... ...

ہاں تو اس کھیت میں لال زعفران کے پھول تو اسی سال لگے ہیں پہلے

یہاں بھی کاسنی پھول ہی اُگا کرتے تھے۔ ساری وادی پر بہار آجاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی نئی نویلی دلہن زعفرانی دوشالہ اوڑھے لیٹی ہے۔ اور خوشبو سے یہ سارا علاقہ مہک اُٹھتا۔ سڑک پر موٹریں جو گزرتیں ان کی دھول کے بادلوں میں بھی یہ خوشبو پھیل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ زمین سے آسمان تک ہر چپہ زعفران میں بسی ہوئی ہے ... ...

تمھاری ہی طرح ایک اور مسافر بھی ایک بار اس کھیت کے پھولوں کو دیکھنے ٹھیر گیا تھا ... ... کئی برس کی بات ہے۔ کوئی بہت ہی سیدھا آدمی معلوم ہوتا تھا بے چارہ، کھیت میں جاکر پھولوں کے بیچوں بیچ میں کھڑا ہوگیا، اور لگا نتھنے پھلا پھلا کر ناک سے سانس لینے، جیسے پھولوں کو سونگھ رہا ہو بلکہ ان کی خوشبو کو پی رہا ہو۔ پھر آپ سے آپ ہی کہنے لگا۔

"عجیب بات ہے۔ کوئی بھی نہیں آئی؟"

میں نے پوچھا۔

کون؟ آخر کس کو کھوجتے ہو"

تو جواب ملا

"ہنسی۔ ہنسی نہیں آئی۔ عجیب بات ہے حالانکہ کتابوں میں تو ... "

تو بیٹا تب پتہ چلا کہ وہ بے چارہ کتابوں میں یہ پڑھ کر آیا تھا کہ اگر زعفران کے کھیت میں کھڑے ہو کر اس کی خوشبو سونگھو تو آپ سے آپ ہنسی آنے لگتی ہے۔ اتنے میں خدا کا کرنا کیا ہوا کہ سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے زعفرانی آگئی۔ میں نے جو اسے یہ بات بتائی تو وہ لگی کھلکھلا کر ہنسنے، اور وہ اجنبی پہلے تو کھسیانا

ہو گیا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ زعفرانی کے قہقہے ختم ہونے ہی میں نہیں آتے تو لگا وہ بھی ہنسنے۔ ان دونوں کو ہنستے دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آگئی۔ اور بعد میں اجنبی کہنے لگا کہ دیکھو کتابوں کا لکھا پورا ہوا کیونکہ زعفران کے کھیت میں ہم تین ہی کھڑے تھے اور تینوں کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔

... ... میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی ... ... بیٹا بڑھاپے میں دماغ قابو میں نہیں رہتا۔ بات کرتے کرتے بہک جاتی ہوں ... ... ہاں تو زعفرانی ... ... کیا کہا ... ... زعفرانی کون؟ ... ... ابھی تو بتا چکی ہوں کہ زعفرانی میری بیٹی تھی ... ... نہیں بتایا تھا؟ ... بھول گئی ہوں گی ... ... لو دیکھ لو یاد کا یہ حال ہے بیٹا ... ... ہاں تو اس کا نام تو اصل میں نوراں تھا، مگر گاؤں میں سب اسے زعفرانی کہہ کر پکارتے تھے۔ بات یہ ہے کہ بچپن ہی سے اس کی رنگت کچھ پیلی پیلی سی تھی، لڑکپن میں بچوں بچیوں کے ساتھ کدال مچایا کرتی تھی۔ وہ اسے زعفرانی کہہ کر چھیڑا کرتے اور جتنا وہ چڑتی اتنا ہی وہ اور شور مچاتے زعفرانی! زعفرانی!! ... ... تم جانو بچے کسی کی مانتے تھوڑا ہی ہیں ... ... ہاں تو جب وہ جوان ہو گئی تو گاؤں کے لڑکے کہنے لگے کہ نوراں جیسی خوب صورت لڑکی تو ہمارے ہاں ایک بھی نہیں ہے۔ اس کی رنگت تو زعفران کے پھول کی طرح ہے۔ اس کی آنکھیں تو کھلے ہوئے کنول ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا اوندھی سیدھی باتیں، مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی و بصورتی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک تو دُبلی تھی جیسے چشمے کے کنارے اُگے ہوئے بید۔ بید مجنوں۔ میں کہتی بھلا ایسی لڑکی بچے کیسے جنے گی؟ اور پھر رنگت بالکل پیلی جیسے بیمار ہو۔ دیدے پھٹے ہوئے۔ اور

سے یہ کہ تمیز نام کو نہیں، نہ چھوٹے کا خیال نہ بڑے کا۔ بس ہر وقت دھما چوکڑی سے مطلب، میں تو ذرا منہ نہیں لگاتی تھی۔ پر تین بھائیوں میں ایک بہن تھی وہ بھی دو سے چھوٹی۔ باپ اور دونوں بڑے بھائیوں نے لاڈ پیار میں بگاڑ رکھا تھا میں سوچتی، ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ پر وہاں تو جس کو دیکھو وہ زعفرانی ہی سے بیاہ کرنے پر تلا ہوا تھا ... تم لڑکوں کی پسند کا بھی کچھ ٹھیک نہیں بٹیا ...

ہاں تو پیغام چاروں طرف سے آرہے تھے۔ یہاں تک کہ ذیلدار نے اپنے لڑکے کا پیغام بھی دے دیا جو شہر کے اسکول میں پڑھ رہا تھا بھلا ایک معمولی کسان کی بیٹی کو اس سے اچھا کون بر مل سکتا تھا؟ ... میں نے سوچا زعفرانی کی قسمت کھل گئی ... پر خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا اس سال جاڑے کے موسم میں نمونیہ کا بخار ایسا چلا کہ گھر والا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ خدا اُسے جنت نصیب کرے، اس کا مرنا تھا کہ ہمارے گھر میں تو آفتوں پر آفتیں آنی شروع ہو گئیں مرنے والے نے مہاجن سے قرضہ لے رکھا تھا۔ اس میں زمین کی قرقی ہو گئی۔ اس پر بھی میری ہمت نہ ٹوٹی۔ تین بیٹے تھے نا۔ میں نے سوچا روپے زمین سے کیا ہوتا ہے میری اصل پونجی تو میری اولاد ہے۔ ہاں ایک زعفرانی کی طرف سے فکر ضرور تھی کہ غریب اور یتیم لڑکی کو کون بیاہے گا۔

... سینکڑوں برسوں سے ہم اس گاؤں میں رہتے چلے آرہے ہیں۔ کبھی فصل اچھی ہوتی ہے کبھی بری۔ کبھی بارش ہوتی ہے کبھی نہیں۔ کبھی اتنا پانی برستا ہے کہ کھیتیاں بہہ جاتی ہیں۔ کبھی دھوپ میں جل جاتی ہیں۔ کبھی برف

میں تباہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی ہم اپنی زمین بوتے ہیں کبھی دوسرے کی۔ قسمت کی اونچ نیچ تو ہر ایک کے ساتھ لگی ہی رہتی ہے۔ اور بیٹا کبھی کبھی راجہ کے افسر ظلم بھی کرتے ہیں۔ پر راجہ پرجا کا کیا مقابلہ۔ صبر شکر سے زندگی کسی نہ کسی طرح بسر ہو ہی جاتی ہے۔ مگر ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ کلجگ ہے کلجگ۔ اس میں جو نہ ہو تھوڑا ہے ...
... کئی برس کی بات ہے ابھی گھر والا زندہ ہی تھا کہ ایک دن میں دھان کوٹ رہی تھی کہ میرا بیٹا نورو چلاتا ہوا آیا۔

"ماں۔ ماں! شیر کشمیر آئے ہیں، شیر کشمیر"

بس اتنا کہہ یہ جا وہ جا۔ میں چلاتی ہی رہ گئی کہ ارے اگر شیر آیا ہے تو ذیلدار صاحب کو بول جا کے بندوق لے کے آویں ... تھوڑی ہی دیر میں کیا دیکھتی ہوں کہ سارے ہی گاؤں والے تو ——— کیا مرد اور کیا عورت اور کیا بچے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا شیر کو پکڑ لیا ہو گا، تبھی تو عورتیں بچے بھی نڈر ہو کر جا رہے ہیں۔ چلو میں بھی تماشہ دیکھوں ... ...

وہ نقشہ آج تک یاد ہے مجھے۔ گاؤں کے اس سرے پر ... اے وہ دیکھو ان درختوں کے پیچھے ——— ایک اسکول ہے ——— اب تو مڈل تک کا ہو گیا ہے۔ پر جب چار جماعتوں ہی کی پڑھائی ہوتی تھی ——— ہاں تو کیا دیکھتی ہوں کہ اسی اسکول کے سامنے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ اور سامنے نہ شیر نہ چیتا، ایک لمبا سا گورا سا آدمی چبوترے پر کھڑا زور زور سے کچھ کہہ رہا ہے۔ لو جی یہ تھا وہ شیر کشمیر ... میں نے کہا " لو خواہ مخواہ ہی ڈرا دیا۔ شیر تو شیر یہ تو کوئی معمولی درجے کا سرکاری افسر بھی نہیں سا ہے۔ بھلا افسر کہیں

گاڑھے کھدر کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے ہیں۔ جس طرح سے وہ زور زور سے تقریر کر رہا تھا، اس سے میں سمجھی کہ چائے بیچنے والا ہوگا۔ اب تھوڑی دیر میں کالا تیار رکھو کے بھونپو والا باجہ بجائے گا۔ پھر مفت چائے سب کو بانٹے گا، اسی انتظار میں میں بھی وہاں جاکر کھڑی ہوگئی۔ پر وہ تو کشمیری میں بول رہا تھا۔ اور اگر یہ چائے والا تھا تو اس کی چائے تو بہت ہی گرما گرم اور خطرناک تھی۔ میں نے دو چار بول ہی سنے تھے کہ ڈر گئی۔ یا اللہ اب ہمارے گاؤں پر کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی۔ وہ باتیں ہی ایسی کر رہا تھا کہ دل دہل جائے۔ ریاست کے اصل مالک راجہ اور اس کے افسر نہیں بلکہ ہم کسان ہیں۔ ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ سب کو مل کر اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہیئے۔ آپس میں ایک ہو جانا چاہیئے۔ لڑکوں لڑکیوں کو پڑھانا چاہیئے۔ پڑھ لکھ کر یہ کشمیری قوم کے لیڈر بنیں گے۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ میں نے تو پوری بات سنی بھی نہیں۔ زعفرانی منہ پھاڑے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔

میں اس کا ہاتھ پکڑ گھسیٹتی ہوئی چلی کہ گھر جا کے اس کے باپ سے ایسا پٹواؤں گی کہ پھر کبھی ہمت نہ پڑے ایسی خطرناک جگہ قدم دھرنے کی۔ پر بھیڑ کے آگے جہاں بڑے بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے وہاں کیا دیکھتی ہوں کہ وہ تو خود ہی وہاں بیٹھا بڑے غور سے سن رہا ہے۔ چل ہی تو گئی میں .... ....

تم تو جانتے ہی ہو تلاؤ کے بیچ میں ایک پتھر پھینک دو۔ سارے پانی میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ تو بیٹا، یہ شیر کشمیر بھی ایسا ہی ایک پتھر تھا جس نے ہمارے گاؤں کے ٹھیرے ہوئے پانی کو ہلا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن آرام چین، صلح شانتی کا نام نہیں رہا۔ جس کو دیکھو بے چین۔ جس کو دیکھو اس کی زبان پر شکایت

ہر ایک اپنی زندگی سے نالاں، اس کو بدلنے پر تلا ہوا۔ میں کہتی ارے تمھارے باپ دادا نے بھی تو اپنی عمر یں انھیں راجوں مہاراجوں کے افسروں کے ظلم سہتے سہتے روکھی سوکھی کھا کر صبر شکر سے کاٹ دیں، تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ ساری دنیا کو بدلنے پر تلے ہوئے ہو … … پر میری کون سنتا ہے، بٹیا … وہ تو اس شیر کشمیر نے جادو ہی ایسا کیا تھا … … تم میری باتوں سے اکتا گئے نا؟ … … وہ زعفران کے لال پھولوں کا بھید؟ ہاں، ہاں، بٹیا۔ اس کی بات تو کر رہی ہوں۔ تم بھی کہتے ہو گے۔ یہ کہاں کا جھگڑا لے بیٹھی۔ پر بات یہ ہے کہ نہ تو گاؤں کے ٹھیرے، شامت تلاؤ میں اس شیر کشمیر کی تقریر کا وہ پتھر گرتا اور نہ یہ زعفران کے پھول لال ہوتے … … یہ کیسے؟ یہی تو بتا رہی ہوں پر تم تو بیچ میں ٹوکتے ہی جاتے ہو۔

ہمارے گاؤں میں اس کو آئے ہوئے دو چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ خبر آئی کہ شیر کشمیر کو راجہ نے پکڑ لیا اور جیل میں بند کر دیا۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا۔ اب سب اس کی سکھائی پڑھائی باتیں بھول جائیں گے۔ اور وادی میں صبر شکر کے دن پھر لوٹ آئیں گے۔ پر جی اس کی گرفتاری پر تو اور بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ جس کو دیکھو غصے میں بھرا ہوا ہے کہ ہمارے شیر کشمیر کو پکڑ لیا۔ اب اس سرکار کی خیر نہیں۔ اور ایسی باتیں کرنے والوں میں سب سے آگے آگے میرے ہی لڑکے۔ تھوڑے دنوں میں سنا کہ چھٹ گیا۔ میں نے سوچا یہ بھی اچھا ہوا نہیں تو یہ لڑکے سرکار کو برا بھلا کہتے رہتے اور ذیلدار یا کوئی سرکاری افسر سن لیتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے … …

... جب تک باپ زندہ رہا تب تک بیٹے کچھ قابو میں رہے ہیں۔ کام نہ تھا کہ جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر چل دیا۔ زمین تو جاتی ہی رہی تھی۔ بڑا غلام نبی کہنے لگا، میں دوسرے کی زمین پر مزدوری نہیں کروں گا۔ اس سے تو بہتر ہے سری نگر یا گلمرگ میں مسافروں کا سامان اٹھا کر لے جانے کا کام کروں۔ دو تین روپے روز کما سکتا ہوں۔ میں نے لاکھ سر پٹخا پر وہ ایک نہ مانا۔ جب گیا ہے تو سارے گاؤں کے لڑکوں میں سب سے زیادہ چوڑا چکلا سینہ تھا اس کا چھ مہینے بعد وہ چار دن کو جو آیا تو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ رنگت زعفرانی سے بھی زیادہ پیلی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ ماتھے پر گاؤ جیسا گہرا گڈھا جہاں بوجھ سنبھالنے کے لئے مزدور پٹا باندھتے ہیں۔ اور رات بھر کھانسنا۔ کبھی کبھی تو اتنا کہ ہوش نہ رہتا۔ میں نے کہا یہ کیا حالت ہو گئی تیری۔ کیا بیمار ہے۔ بولا نہیں ماں۔ بوجھ اٹھانے والوں کے ماتھوں پر ایسا گڈھا تو پڑا ہی رہتا ہے۔ رہی کھانسی تو وہ اس دن تنگ مرگ سے ایک صاحب کا سامان گلمرگ لے جا رہا تھا، بیچ میں بارش آ گئی۔ بھیگنے سے زکام کھانسی ہو گئی ہے ... چار دن کے بعد جب وہ تنگ مرگ گیا تو منجھلا نورو بھی ساتھ ہو لیا۔ کہنے لگا ماں باپ کا لحاظ ہی نہیں رہا تو یہاں رہنے سے کیا فائدہ۔ نورو کو گئے تین چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ ذیلدار نے شہر سے آ کر کہا۔ غلام نبی کی ماں اب تمہاری خیر نہیں ہے۔ تمہارا منجھلا بیٹا نورو شیخ عبداللہ کی پارٹی میں مل گیا ہے۔ دن میں گشتی چلاتا ہے۔ رات کو مزدوروں کے جلسوں میں جا جا کے تقریریں کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ بی منڈی کو بھی زکام ہوا وہ شیر کشمیر تو نا ماسٹر تھا پہلے۔ اس کسان کے چھوکرے کو دیکھو یہ بھی چلا ہے

لیڈری کرنے۔ پر میں نے سب سے کہہ دیا کہ آج سے میرے سامنے اس کا نام نہ لینا۔ نہ وہ میرا بیٹا۔ نہ میں اس کی ماں ...

... زعفرانی ؟ تو اس کا تو ذکر ہی کرنا بھول گئی۔ تو بیٹا اب ہمارے گھر میں رہ ہی گیا تھا کون۔ بس میں۔ زعفرانی اور سب سے چھوٹا لڑکا غفورا۔ زعفرانی اب بیس برس کی بن بیاہی بیٹھی تھی۔ گھر میں پیسے ہوں تو اس کی شادی کی بات چیت کروں۔ اور یہاں اول تو آمدنی ہی صفر تھی۔ ادھر سنا۔ سمندر پار ولایت میں لڑائی شروع ہو گئی، تو مہنگائی کا یہ عالم ہوا کہ بس کچھ پوچھو مت۔ میں اور زعفرانی دونوں کام کرتے تھے۔ کبھی کسی کے کھیت پر، کبھی جنگل سے لکڑیاں چن لاتے، کبھی پانی بھرتے۔ کبھی اون کاتتے۔ تب جا کے دو وقت چولھا جلتا۔ میں نے کہا۔ غفورا دس برس کا ہو گیا۔ لاؤ اس کو بھی کام پر لگا دیں۔ پر زعفرانی بولی نہیں ماں ہم تو غفورا کو مدرسے پڑھنے بھیجیں گے۔ میں نے کہا پاگل ہو گئی ہے۔ پر وہ ایک نہ مانی۔ مجھ سے کہے سنے بغیر اگلے دن سویرے خود اسے لے جا مدرسے میں داخل کروا آئی۔ جوان برابر کی لڑکی۔ اب میں اسے کہوں بھی تو کیا کہوں۔ پھر اس کے بیاہ نہ ہونے کا بھی دکھ تھا۔ اس واسطے میں چپ ہی ہو گئی ...

... مگر میرا ماتھا ضرور ٹھنکا کہ آج اس گھر کا پہلا لڑکا مدرسے گیا ہے۔ اب نہ جانے کون سی مصیبت آئے گی ... ... پر بیٹا اس لونڈیا پر تو پڑھائی کا بھوت سوار تھا دن رات بھائی کے پیچھے پڑی رہتی ... ... مدرسے سے آتا تو کہتی گھر پر بیٹھ کر پڑھ۔ حساب کے سوال پوچھنے ماسٹر کے ہاں جا۔ یہ کر وہ کر۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کتابیں گھول کر غفورا کو پلا دے ...

..... جس گھر میں بیری کا پیڑ ہوتا ہے بیٹا، وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں ..... بیس اکیس برس کی لڑکی۔ پھر شکل صورت میں حور کا بچہ نہیں تھی تو کانی بھینگی چیچک داغ بھی نہیں تھی۔ اور تم جانو آج کل کے لونڈے۔ شہر جا کے سینما، بائسکوپ، ناچ رنگ نہ جانے کیا کیا دیکھ کے کیسے آوارہ ہو گئے ہیں ایک دن زعفرانی لکڑیاں چننے گئی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں خالی ہاتھ واپس چلی آ رہی ہے۔ زار و قطار روتی ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا، تو کچھ جواب نہیں بس روئے چلی جا رہی ہے۔ اری کم بخت کچھ کہے گی بھی کیا ہوا۔ کسی نے مارا، گالی دی۔ چوٹ لگ گئی۔ آخر ہوا کیا۔ اس کا جواب سن کر میں تو دنگ رہ گئی بیٹا بات ہی اس نے ایسی کہی جو کسی ماں نے اپنی بیٹی کی زبان سے کبھی نہیں سنی ہو گی۔ کہنے لگی۔

" ماں! میرا بیاہ کر دو "۔ اور پھر لگی رونے۔ دس دفعہ پوچھا تب یہ بات کھلی کہ لکڑیاں چن رہی تھی کہ ذیلدار کا لڑکا جو شہر سے آیا ہوا ہے ادھر آن نکلا اور لڑکی کو اکیلا دیکھ کر لگا اسے چھیڑنے اور اول فول بکنے۔ جب زعفرانی نے جھڑکا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر بد ارادے سے اپنی طرف گھسیٹنے لگا۔ بڑی مصیبت سے ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی آئی تھی بے چاری۔ مگر اس بدمعاش کی ہول بیٹھی ہوئی تھی، دل میں ابھی تک پتے کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اور رو رہی تھی۔ اور جب ہچکیاں ذرا رکتیں تو یہی کہتی۔

" ماں میرا بیاہ کر دو۔ نہیں تو ایک دن میری عزت مٹی میں مل جائے گی ..... "

... اب تم ہی بولو بیٹا، غریب عورت کرے تو کیا کرے۔ جب دمڑی پاس نہ ہو تو کس برتے پر لڑکی کا بیاہ رچائے ... ... پھر بھی میں نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی کہ کوئی غریب مگر طبیعت کا شریف آدمی مل جائے جو زعفرانی کو بیاہ لے، تو یہ فکر تو دور ہو جائے۔ مگر پچاس ساٹھ روپے تو تب بھی چاہیئں۔ زمین زیور یہاں تک کہ میرے اور زعفرانی کے کانوں کے بالے بھی بک چکے تھے۔ اب تو کچھ بھی نہیں تھا جس کے سہارے قرضہ ہی مل جاتا۔ اسی ادھیڑبن میں لگی ہوئی تھی کہ ایک دن ایک آدمی آیا۔ شکل صورت سے بے چارہ قلی معلوم ہوتا تھا۔ وہی ماتھے پر "پٹے" کا نشان۔ عمر پتہ نہیں کیا تھی۔ پر پچاس کا معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا۔

"غلام نبی نے یہ بھیجا ہے۔ میں اس کا دوست ہوں محمدو"۔ یہ کہہ کر ایک میلے سے کپڑے کی پوٹلی میرے سامنے رکھ دی۔ کھول کر دیکھا تو نوٹ اور روپے اور کچھ ریزگاری۔ گنے تو پانچ اوپر ساٹھ روپے اور دس آنے ہوئے۔ وہ بولا۔

"غلام نبی نے کہا تھا کہ ماں سے کہنا۔ اس روپے سے زعفرانی کا بیاہ کر دیں"

میں نے خدا کا شکر کیا کہ بیٹے کے دل میں ماں بہن کا خیال تو آیا۔ پھر محمدو کے منہ پر کچھ عجیب سی حالت دیکھ کر میں نے پوچھا۔

"غلام نبی کا کیا حال ہے؟ وہ نہیں آیا؟"

محمدو کے گلے میں آواز پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ٹھیر ٹھیر کر بولا جیسے بولنا نہ چاہتا ہو۔

"ماں جی! غلام نبی تو چل بسا۔ اُسے دق ہو گئی تھی"۔ اور بس چپ ہو گیا

... ... بیٹیا! تم لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ بیٹے کی موت کا ماں پر کیا اثر ہوتا ہے ... ... ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کلیجے کا ٹکڑا کسی نے کاٹ کر نکال لیا ہو۔ ماں نو مہینے بچے کو پیٹ میں رکھتی ہے نا۔ دو سال دودھ پلاتی ہے۔ بچہ اس کے خون، اس کے گوشت پوست سے بنتا ہے۔ اور پھر وہ بڑا ہو کر غلام نبی کی طرح چوڑے چکلے سینے والا نوجوان ہو جاتا ہے۔ اور پھر گدھے کی طرح صاحب لوگوں کا سامان ڈھوتے ڈھوتے خون کی کھانسی کھانستا ہوا مر جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ماں بھی مر جاتی ہے ... ... اور سب سے بڑی موت یہ ہوتی ہے کہ وہ پھر بھی زندہ رہتی ہے ... ...

میرا تو، جو حال ہوا سو ہوا، زعفرانی پر بھائی کی موت کا کچھ عجیب ہی اثر ہوا، چھوٹے بھائی کی پڑھائی کی اور بھی فکر پڑ گئی۔ ہر وقت اس کی جان پر سوار رہتی کم پڑھ۔ تختی لکھ۔ مدرسے کا کام کر۔ گھڑی بھر کھیلنے کی بھی چھٹی نہ دیتی۔ جیسے اُسے کوئی خاص جلدی ہو کہ سال بھر کی مدرسے کی پڑھائی دو چار دن ہی میں پوری ہو جائے۔ نہ جانے کیوں اتنی جلدی تھی اُسے۔ نہ جانے کیوں؟ ... ...

ہاں اور محمدو کے پاس بیٹھ کر زعفرانی نے بھائی کے آخری دنوں کا سب حال کرید کرید کر پوچھا۔

"کب اور کیسے بیمار پڑا؛ علاج ہوا یا نہیں؟ کیا سب سامان ڈھونے والے مزدوروں کو اسی طرح دق ہو جاتی ہے؟"

اور جب محمدو نے کہا۔

"ہاں بہت سوں کو" ۔ تو نہ جانے کیوں زعفرانی نے اس سے پوچھا

"تو کیا تم واپس جاکر پھر یہی کام کرنے لگو گے؟ یہاں کیوں نہیں رہ جاتے؟"... ... نہ جانے کیوں ... ...

... ... میرے کہنے سے محمدو ہمارے ہاں تین دن اور ٹھیرا۔ جس روز وہ جا رہا تھا میں نے اس سے پوچھا

"کیوں محمدو! جب یہ کام اتنا خطرناک ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟"

وہ بولا۔

"چھوڑ کر کیا کروں گا، ماں جی؟۔ اور کوئی کام آتا نہیں ہے۔ اور پھر کوئی آگے ہے نہ پیچھے۔ نہ ماں نہ باپ ..."

میں نے جلدی سے پوچھا

"اور بیوی؟"

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"کب کی مرگئی"

پتہ نہیں وہ میرا مطلب سمجھا یا نہیں اپر میں نے کہا۔

"دوسری کیوں نہیں کر لیتے؟"

اس کو تین دن میں میں نے ہنستے تو کیا مسکراتے بھی نہ دیکھا تھا۔ پر اس بات پر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ہوئی اور اس کے سوکھے چمڑے جیسے چہرے پر ہنسی کی جھریاں پڑگئیں۔

"مجھ سے کون بیاہ کرے ہے، ماں جی؟"

... ... تو بیٹا یوں زعفرانی کا بیاہ محمدو سے طے پا یا۔

... کیا کہا؟ زعفرانی کی رائے؟ ... بٹیا بھلا شادی بیاہ کیا لڑکیوں کی صلاح سے ہوتے ہیں۔ پر میں نے زعفرانی سے ذکر کیا کہ اگلے چاند کی بیسویں کو محمود اسے بیاہنے آئے گا۔ تو یہ تو میں نہیں کہوں گی کہ وہ سن کر خوش ہو گئی۔ بھلا شریف لڑکیاں کیا شادی کے ذکر پر خوش ہوا کرتی ہیں ... پر اس کے چہرے سے اطمینان ضرور ٹپکتا تھا۔ جیسے اب اس کی کوئی چنتا دور ہو گئی ہو۔

... شادی کی چھوٹی موٹی تیاریوں میں دن گزر گئے۔ ہاں بٹیا، آخر ہم غریبوں کو بھی کچھ نہ کچھ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ چاہے ایک ہی جوڑا اور دو چاندی کے بالے ہوں۔ جس دن محمود آنے والا تھا اسی دن میں نے سویرے ہی سے زعفرانی کو اٹھا کر نہلا دھلا شادی کا جوڑا پہنا دیا۔ گلابی رنگ کا پیراہن اور اس کے نیچے سبز پھول دار چھینٹ کی شلوار۔ ہم پرانے زمانے کی کشمیری عورتیں تو بس لمبے لمبے پیراہن ہی پہنا کرتی تھیں۔ مگر اسی شیر کشمیر کے کہنے سے آج کل لڑکیوں نے شلواریں بھی پہننی شروع کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ زعفرانی تو مجھے بھی مجبور کرتی تھی کہ ماں شلوار پہنو نہیں تو شیر کشمیر خفا ہو جائیں گے۔ شیر ویر سے ڈرے میری بلا، پر اور عورتیں بھی اب شلوار پہننے لگی تھیں۔ سو میں نے سوچا میں ہی کیوں نکو بنوں۔ سو میں نے بھی سلوا لی ...

... اتنا غصہ آیا ہے مجھے اس شیر کشمیر پر کہ کمبخت کو اگر پکڑا جانا تھا تو کیا اسے وہی دن جڑا تھا جب میری بیٹی کا بیاہ طے پایا تھا۔ یکایک سارے گاؤں میں شور مچ گیا، "شیر کشمیر پکڑے گئے۔ شیر کشمیر پکڑے گئے" مجھے کیا پتہ کیوں سرکار نے اسے پکڑا تھا ... میری طرف سے اگر سال کے بارہ مہینے

قید رکھا جاتا تم اور بھی اچھا تھا ... پر یہ ضرور سنا کہ اب کے اس نے خود راجہ ہی کو ریاست سے باہر نکالنے کی بات چلائی تھی۔ میں نے کہا اب کے اس شیر نے شیر ببر کے بھٹ میں پنجہ ڈالا ہے۔ اب یہ زندہ نہیں بچے گا۔ باہر شور کی آواز ہوئی تو میں گلی میں آئی یہ سوچ کر کہ شاید محمد و اور اس کے ساتھی برات لائے ہوں مگر وہاں تو بچے دھینگا مشتی مچا رہے تھے۔ دو چار لال جھنڈے جن پر ہل بنا ہوا تھا لئے "شیر کشمیر زندہ باد،، "ڈوگرا راج مردہ باد" کہتے پھر رہے تھے۔ اور ہمارا نور د چھ اینٹوں کا چبوترہ بنائے سفید کھریا سے دیوار پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اور زور زور سے ہجے پڑھتا جاتا تھا ... ک ش م ی ر چھ وڑ دو" ... ... اور زعفرانی دروازے میں کھڑی غفورا کو دیکھ رہی تھی اور اب اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی جیسے اس نے کوئی بڑا کام پورا کر لیا ہو۔

... ... ہاں تو ابھی میں اندر جا کر بیٹھی ہی تھی کہ باہر سے رونے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ میں نے جو دیکھا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک خاکی رنگ کی موٹر لاری کھڑی تھی، اور اس میں سے سپاہی کود کر بچوں کو لاٹھیوں سے مار رہے تھے۔ میں دیوار کی طرف دوڑی، جہاں پل بھر ہوئے غفورا کھڑا ہوا کھریا سے لکھ رہا تھا۔ پر غفورا وہاں نہیں تھا۔ ہاں خون کی ایک لکیر زمین پر کھنچی ہوئی تھی اور اس لکیر کی سیدھ میں جو میں نے دیکھا تو غفورا کو زمین پر بے ہوش پڑا پایا۔ اس کے سر میں ایک گہرا گھاؤ تھا جس میں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک کھریا کا ٹکڑا تھا ... میں اپنے غفورا کو اٹھا کر اندر لے آئی اور وہاں اپنی بہن کی گود میں اس نے جان دے دی۔ اور بے ہوشی میں

بھی آخر وقت تک اس کے ہونٹ انھی حرفوں کو دہراتے رہے جنھیں وہ بار دیوار پر لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ک۔ش۔م۔ی۔ اور ابھی ر نہیں کہہ پایا تھا کہ گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک ہچکی آئی۔ اور اس مہینے میں دوسری بار مجھے موت آئی پر نہ آئی … … …

… … اور اس کے بعد کیا ہوا، بیٹا، یہ مجھے ایسا یاد ہے، جیسے کوئی ڈراؤنا خواب ہو جس میں ایک خوفناک بات کا دوسری خوفناک بات سے کوئی تعلق نہ ہو، مگر پھر بھی خوف اور دہشت کا پہاڑ اٹھتا چلا جائے … …

… … زعفرانی کی آنکھیں جو کبھی کنول سے ملتی جلتی ہوا کرتی تھیں اس وقت دو دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں … … آنسوؤں کا نام نہیں تھا۔ نہیں تو وہ آگ بجھ جاتی جو اس وقت ان میں سلگ رہی تھی …

… … اور پھر سارے گاؤں والوں کا ایک جلوس۔ مردوں سے آگے عورتیں۔ اور عورتوں میں سب سے آگے زعفرانی۔ وہی اپنی شادی کا جوڑا پہنے ہوئے۔ اور اس کی آنکھوں میں وہی دہکتی ہوئی آگ۔ اور یہ سارا مجمع گاتے ہوئے کھیتوں میں سے ہو کر سڑک کی طرف جاتا ہوا۔ جہاں بالکل اسی جگہ جہاں تمھاری موٹر کھڑی ہے، سپاہیوں کی خاکی لاری کھڑی تھی۔

… … بڑی بڑی مونچھوں اور کالی رنگت والے سپاہی اور ان کی بندوقیں جو ٹکٹکی باندھے اس جلوس کی طرف ان عورتوں کی طرف، زعفرانی کی طرف دیکھ رہی تھیں … …

… … ایک تڑاخہ۔ دس بارہ تڑاخے۔ سب تتر بتر ہو کر

بھاگے۔ اور اس کھیت کے بیچوں بیچ اپنی چھاتی کو سنبھالتی ہوئی زعفرانی نرم مٹی میں اس طرح گر گئی جیسے ماں کی گود میں بچہ آن کر گر پڑے میں ادھر بھاگی۔ پر جب تک میں پہنچوں، زعفرانی کی چھاتی میں سے خون کی ایک دھار بہتی ہوئی کھیت کی سوکھی مٹی کو سیراب کر رہی تھی ...

... عورت کی چھاتی اور اس میں سے دودھ کے بجائے خون ... ... خون مٹی میں مل رہا تھا ... ...

اور میری بیٹی میری گود میں جان دے رہی تھی۔ پر مرتے دم تک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اور نہ جانے کیوں آخری ہچکی سے پہلے اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔

"میرا بیاہ ہو گیا ماں"

... ... یہیں اسی کھیت میں جہاں تم اب گل لالہ کی طرح سرخ زعفران کے پھول دیکھتے ہو۔

... ... سنی بیٹا، تم نے میری کہانی؟ ... ... پر تم کہاں ہو؟ ... ... چلے گئے نا تم؟ ... ... میں نہ کہتی تھی کہ ابھی تمھاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم لوگ چلے جاؤ گے اور کہانی نہ سن پاؤ گے ... ... موٹریں تو اس سڑک پر سے گذرتی ہی رہتی ہیں، بیٹا، پل دو پل کو ٹھیرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آجائے گا۔ اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو

بھیج دیئے جائیں گے۔ اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوانوں پہ سے مہکے گی۔ اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے کہ "اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح لال کیوں ہے؟ ... ... پر کوئی نہ بتا پائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں ... ... ...

# اجنتا

سردار جعفری کے نام

# اجنتا

"اجنتا ہندستان کے آرٹ کی معراج ہے، دنیا میں اس کا جواب نہیں ہے ... بڑے بڑے انگریز اور امریکن یہاں آکر دم بخود رہ جاتے ہیں ... یہ غار ڈیڑھ ہزار سال پرانے ہیں۔ ان کو کھودنے، تراشنے، ان میں مجسمے اور تصویریں بنانے میں کم سے کم آٹھ سو برس کا عرصہ لگا ہوگا ... مہاتما بدھ کے اس مجسمے کو دیکھئے ... ..."

سرکاری گائیڈ کی منجھی ہوئی آواز غار کی اونچی پتھریلی چھت سے ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ اٹھائیس روپے ماہوار تنخواہ اور روپیہ ڈیڑھ روپیہ روزانہ "بخشیش" کے عوض وہ اپنا طوطے کی طرح رٹا ہوا سبق دن میں نہ جانے کتنی بار دہراتا تھا نرمل کو اس کی آواز ایسی معلوم ہوئی جیسے رہٹ چل رہا ہو، یا چرخہ یا کولھو۔ روں، روں، روں، روں — ایک بے معنی، بے روح آواز کا لامتناہی سلسلہ جو ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔

بھارتی —— جو آرٹ کی پرستار بھی تھی اور خود آرٹ کا ایک نادر

نمونہ بھی ـــــ گائیڈ کے الفاظ پر سر دھن رہی تھی۔ ہزاروں برس پرانے آرٹ کے اس اتھاہ سمندر میں وہ ڈوب جانا چاہتی تھی۔ ہر تصویر، ہر مجسمے، ہر ستون ہر محراب، ہر پھول اور پتی کو دیکھ کر اس کے منہ سے تعریف کا چشمہ بے اختیار پھوٹ نکلتا تھا ـــــ "اوہ نرمل یہ دیکھو ... اوہ نرمل وہ دیکھو ... مہاتما بدھ کے چہرے پر کتنا سکون اور شانت اکسپریشن ہے ... اس اپسرا کے بالوں کا سنگھار تو دیکھو ... ہاؤ سویٹ ... کتنا سندر ... ہاؤ ونڈرفل ... "

نرمل خاموش تھا۔ وہ نہ گائیڈ کی رواں رواں سن رہا تھا اور نہ بھارتی کے پرجوش تعریفی جملے ... اس کی نگاہیں دیوار پر بنائی ہوئی تصویروں پر ضرور تھیں۔ مگر اسے سوائے دھندلے رنگین دھبوں کے کچھ نظر نہیں آرہا تھا ... اس کے کان گائیڈ کی رٹی ہوئی تقریر کو سن رہے تھے، پر اب تک وہ صرف آواز تھی۔ بے معنی۔ دھیما دھیما شور۔ چرخے یا کولھو یا رہٹ کی رواں رواں کی طرح ... بھارتی جب بولتی تو نرمل کو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے کانوں پر کوئی غیر متعلق اور قطعی غیر ضروری چوٹ پڑی ہے ... جیسے گرمی کی دوپہر میں تانبے کی طرح تپتا ہوا آسمان ایک اڑتی ہوئی چیل کی ہیبت ناک چیخ سے گونج اٹھے ...

نہ جانے وہ کس نمبر کے غار میں تھے۔ نہ جانے وہ کس تصویر کے سامنے کھڑے ہوئے تھے ...

گائیڈ کی رواں رواں جاری تھی ... یہ دیکھئے ایک پچھلے جنم

ہیں سنیاسی کے روپ میں مہاتما بدھ اُپدیش دے رہے ہیں۔ بنارس کے راجہ کی یہ نکی مہاتما بدھ کا اپدیش سنتی ہے ... راجہ کو جب یہ معلوم ہوتا ہے تو وہ خود جاکر سنیاسی سے سوال جواب کرتا ہے ... تم کون ہو اور کیا اپدیش دے رہے ہو؟ ... وہ کہتے ہیں میں شانتی اور سچائی کا ذکر کر رہا ہوں ... راجہ اپنے جلاد کو حکم دیتا ہے کہ وہ سنیاسی کے ہاتھ، پاؤں، ناک، کان تلوار سے کاٹ ڈالے۔ پر ہر بار مہاتما بدھ نے یہی کہا کہ شانتی اور سچائی تو میرے دل میں ہے۔ ناک، کان۔ ہاتھ، پاؤں میں نہیں ہے ... یہ دیکھئے ان کے زخموں سے خون ... ... "

خون!

گائیڈ کی بے معنی، لامتناہی رواں رواں میں سے اس ایک لفظ نے نرمل کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح ایک چوٹ لگائی

خون!

اجنتا کے غاروں کی پتھریلی دیواریں یک لخت فضا میں تحلیل ہو گئیں۔

—— اب وہاں نہ مجسمے تھے، نہ تصویریں نہ ستون —— نہ گائیڈ اور نہ بھارتی —— نہ سرسبز پہاڑیاں، نہ وہ سریلے شور کے ساتھ بہنے والی ندی —— نہ آرٹ اور نہ تاریخ —— نہ دھرم اور نہ مذہب —— نہ مہاتما بدھ اور نہ بنارس کا ظالم راجہ ... ...

خون!

خون کی ندیاں۔ خون کے دریا۔ خون کا سمندر۔ اور ان خونیں لہروں پر

بہتا ہوا انرمل پھر بمبئی واپس پہنچ گیا۔ وہی خونی بمبئی جس سے بھاگ کر اس نے تین سو میل پرے اور ڈیڑھ ہزار برس پرانے غاروں میں پناہ لی تھی ...

یکم ستمبر ____ شام کو حسب معمول وہ اپنا کام ختم کر کے گرگام اپنے دوست وسنت کے دفتر گیا تھا کہ دونوں ساتھ ہی ٹرین سے دادر جائیں گے کہ خبر آئی کہ شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے۔ کام چھوڑ کر ہر کوئی اس مضمون پر رائے زنی کرنے لگا۔

"تم دیکھنا یہ فساد چند گھنٹے میں دب جائے گا۔ اس بار گورنمنٹ نے پوری تیاریاں کر رکھی ہیں ... "

"پر آج کیسے ہو گیا؟ ____ مسلم لیگ کالے جھنڈوں کا مظاہرہ تو کل کرنے والی ہے ... ... "

"یہ کلکتہ کی خبروں کا اثر ہے ... "

"سنا ہے کئی ہزار چھرے پکڑے گئے ہیں ... "

"سنا ہے گول پیٹھا پر پنڈت جواہر لال نہرو کی تصویر کو ایک مسلمان نے پرانے جوتوں کا ہار پہنا رہا تھا ... ... "

"سنا ہے بھنڈی بازار میں مسلمانوں نے کئی ہندوؤں کو مار ڈالا ... "

"پر تم فکر نہ کرو، اب کے ہندو چپکے بیٹھنے والے نہیں ہیں ... "

اتنے میں امبولینس کار کی گھنٹی کی آواز آئی اور سب کھڑکی کی طرف بھاگے سامنے ہرکشن داس اسپتال کے دروازے میں زخمیوں کی موٹر داخل ہو رہی تھی ایک سمٹے ہوئے جسم کے راہ گیر نے جو دھوتی، اجلی دھاری دار قمیص اور کالی مرہٹہ

ٹوپی پہنے ہوئے تھا، اسپتال کے دربان سے پوچھا

"یہ کون تھے؟ ہندو یا مسلمان؟"

دربان نے جو موٹر میں جھانک چکا تھا جواب دیا۔

"ایک مسلمان، دو ہندو"

اور فوراً کونے کے ہندو ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے گروہ میں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔

ساری چرنی روڈ پر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ہوٹل کے سب دروازے بند تھے۔ صرف بیچ والے لوہے کے جنگلے کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ ٹرام دیر ہوئی بند ہو چکی تھی۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ ہاں اوپر کی منزلوں سے لوگ جھانک رہے تھے۔ فضا میں ایک عجیب تناؤ تھا جیسے تنا ہوا ڈھول چوٹ پڑنے کا منتظر ہو"

یکایک سینڈھرسٹ روڈ کے چوراہے کی طرف سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہر شخص کی نگاہیں آواز کی سمت پھر گئیں۔ ایک دُبلا سا نوجوان کرتا پاجامہ پہنے آ رہا تھا۔ بالکل بے فکر جیسے شہر میں فساد ہوا ہی نہیں تھا۔

"سالے کی ہمت تو دیکھو!"۔ ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے گروہ میں سے ایک آدمی نے کہا اور گٹھے ہوئے جسم کے آدمی کا ہاتھ دھاری دار قمیص کے نیچے اپنی میلی دھوتی کی تہوں میں نہ جانے کیا تلاش کرنے لگا۔

بے فکر دبلا نوجوان اب وسنت کے دفتر کی کھڑکی کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ نرمل نے دیکھا کہ اس کے ململ کے کرتے میں سے اس کی ہڈیاں نظر آ رہی

ہیں۔ سانولا سا رنگ، چھوٹا سا قد، مگر اچھا ذہین چہرہ۔ کوئی کلرک یا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں نرمل کا جی چاہا، چلا کر کہے۔ "میاں بھائی ذرا سنبھل کے آگے جانا۔ بڑا خراب وقت ہے"۔ پر اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ اور چشم زدن میں اس نے ایک چمکیلی چھری کو ہوا میں بلند ہوتے دیکھا۔

چھری دستے تک دبلے پتلے نوجوان کی کمر میں اتر گئی۔ اس کے ہاتھ ایک بار بے اختیار اٹھے، شاید بچاؤ کرنے کے لئے، مگر اگلے لمحے میں وہ چکرا کر گر پڑا۔ اور اس کے منہ سے ایک کراہتی ہوئی آواز نکلی جو فریاد بھی تھی اور آخری ہچکی بھی۔

"ہائے بھگوان"

اور ہوٹل کے سامنے کے مجمع میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

"ارے یہ تو ہندو ہے ہندو"

"نہیں رے سالا بن رہا ہے"

"پاجامہ پہنے ہندو کیسے ہو سکتا ہے؟"

"سالے کا پاجامہ کھول کر ختنہ دیکھو"

چھری ابھی تک نوجوان کی کمر میں گڑی ہوئی تھی، مگر اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کئی آدمیوں نے بڑھ کر سسکتی ہوئی لاش کو پلٹ دیا اور ایک نے کمر بند کی ڈوری کو کھینچ کر گرہ کھولی۔

نرمل کی آنکھیں شرم سے بند ہو گئیں، اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے غلاظت کے ڈھیر میں اس کا منہ رگڑ دیا ہو۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو قاتل لاش کو پھر الٹ کر زخم میں سے اپنی چھری باہر کھینچ رہا تھا۔

"یہ تو مشٹیک ہو گیا"

اس نے کہا۔ اور اپنی میلی دھوتی میں سے ایک کترن پھاڑ کر اس سے چھری کا خون پونچھنے لگا۔

چھری جب زخم سے باہر نکلی تو نرمل نے دیکھا کہ زخم سے سیاہی مائل گاڑھا گاڑھا خون بہہ نکلا۔ اور مقتول نوجوان کے کپڑوں کو رنگتا ہوا سڑک پر پھیل گیا ...... ......

خون!

"خون خرابے، فساد دنگے سے دور یہ کتنی سندر اور شانت دنیا ہے نرمل؟"

بھارتی نے نرمی سے، پریم سے نرمل کی کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ایک جھٹکے کے ساتھ ایک لہر نے اسے خونی سمندر کے باہر کنارے پر لا پھینکا۔

"کیا۔ کیا کہا تم نے بھارتی؟"

"میں کہہ رہی تھی کہ اجنتا کے ان خاموش پرسکون غاروں میں ہم بمبئی کے خون خرابے سے کتنی دور معلوم ہوتے ہیں۔ کئی ہزار برس دور، یہاں تم ضرور ان خوفناک نظاروں کو بھول سکو گے جو تم نے بمبئی میں دیکھے ہیں ..."

بیچاری بھارتی! حسین اور حسن پرست بھارتی؟ اس کا دل پریم سے کتنا

بھرپور تھا اور اس کا دماغ سمجھ بوجھ سے کتنا خالی، اسے نرمل سے واقعی محبت تھی اور وہ اسے ایک منٹ کے لئے بھی دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جس دن فساد شروع ہوا اس سے اگلے دن ہی وہ جان گئی کہ نرمل کا نازک اور حساس دماغ اس خون خرابے کی تاب نہیں لا سکتا۔ چرنی روڈ کے خون کے بعد جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا نرمل نے تین دن کھانا نہ کھایا اور نہ ہی وہ سو سکا۔ اس کو چپ سی لگ گئی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر ایک گہرا سکوت طاری تھا۔ اس نے کسی کو اس کی وجہ نہ بتائی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے پوچھا بھی تو اس نے ٹال دیا۔ پر، بھارتی سے وہ ہر بات کہہ دیتا۔ اس کی گود میں سر رکھ کر نرمل نے اس خونیں واقعہ کی تمام ہولناک تفصیل اس کو سنا دی۔

"اس دبلے پتلے نوجوان کی صورت اب میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے، بھارتی اس کی آخری چیخ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے، اس نے میری نیند اڑا دی ہے۔ رات کو سوتا بھی ہوں تو خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں ایک خون کے سمندر میں ڈوب رہا ہوں، اور کوئی میری مدد کو نہیں آتا۔"

اور گھونگر والے بالوں میں اپنی ملائم انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے بھارتی نے کہا۔

"بیچارہ نرمل"

اپنی محبت، اپنی باتوں، سینما، گراموفون، ریڈیو، کس کس طرح اس نے اپنے دوست کے دل سے اس واقعہ کو بھلانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ ناکامیاب رہی۔ نرمل کی شگفتگی، اس کی مشہور ظرافت، اس کی حاضر جوابی سرے سے غائب

ہو گئی تھی۔ وہ جب کبھی بھی بھارتی سے ملنے آتا تو گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا اور اس کی وحشت بھری آنکھیں ٹکٹکی باندھے فضا میں نہ جانے کیا دیکھتی رہتیں۔

وہ کہتی ۔

"میں جانتی ہوں، نرمل تمہارے حساس دماغ کو کتنا گہرا گھاؤ لگا ہے، مگر سب کو ان کے لئے اپنے آپ کو سنبھالو، اور اس واقعہ کو بھلانے کی کوشش کرو"

وہ جواب دیتا

"ہاں بھول ہی جانا چاہیئے" اور وہ سوچتا۔ "کون کون سے واقعات بھلانے کی کوشش کروں؟"

نرمل کمار قدرت کی طرف سے ایک شاعرانہ دل اور دماغ لے کر آیا تھا۔ اس کی غزلیں اور نظمیں، مضامین، انشائے لطیف اور افسانے ملک کے چوٹی کے رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ امیر باپ کی بیٹی بھارتی اس کی ادبی قابلیت کی قدرداں اور مداح تھی، اس کا بس چلتا تو نرمل کے لئے کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایک خوبصورت بنگلہ بنوا دیتی، جہاں وہ سکون سے اپنے تخلیقی کام میں مصروف رہتا۔ مگر وہ تو ایک روزانہ اخبار میں رپورٹر تھا۔ بھارتی اکثر کہتی کہ اس جیسے ادیب کے لئے جرنلزم اختیار کرنا سراسر ظلم تھا۔

نرمل کہتا کہ موجودہ ہندوستان میں ادبی تخلیق صرف دماغی تعیش ہے اور لکھنے والے کے لئے اخبار نویسی ہی پیٹ پالنے کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ رپورٹر کی حیثیت سے وہ زندگی کے ڈرامائی عناصر سے دوچار رہتا

عدالت کے مقدموں، تھانے کوتوالی کی وارداتوں، مزدوروں کی ہڑتالوں، جلسوں اور جلوسوں میں اس کو انسانی سیرت کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا اور یہی مشاہدات اس کے تخیلقی سانچے میں ڈھل کر ایسے مضامین، افسانے، اور نظمیں بن جاتے تھے جن میں زندگی کی سچائی، زندگی کی تڑپ اور زندگی کی روح نظر آتی تھی۔

رپورٹر کی حیثیت سے نرمل کو فساد کے زمانے میں بھی سارے شہر میں گھومنا پڑتا تھا۔ سینڈہرسٹ روڈ، بھنڈی بازار۔ پائیدھونی۔ بائیکلہ۔ پریل دادر۔ سارا شہر میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ ہر محاذ پر خون اور قتل کے واقعات ہو رہے تھے۔ یہاں ایک مسلمان ڈبل روٹی والا مارا گیا۔ وہاں ایک ہندو دودھ والے کو کسی مسلمان نے چھرا گھونپ کر مار ڈالا۔ یہاں ایک پٹھان کا خون ہوا۔ وہاں ایک پوربی بھیا قتل ہوا۔ یہاں ایک دس برس کے بچے کو کسی نے ذبح کر دیا۔ وہاں ایک گیارہ برس کے بچے نے ایک راہ چلتے آدمی کی پسلیوں میں چاقو بھونک دیا۔

سارا شہر "ہندو بمبئی" اور "مسلمان بمبئی" میں منقسم ہو گیا۔ کسی ہندو کی جرأت نہ تھی کہ بھنڈی بازار میں قدم دھر سکے۔ کسی مسلمان کی ہمت نہ تھی کہ پائیدھونی سے گزر سکے۔ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان قائم ہو گئے تھے۔ نرمل اور دوسرے رپورٹروں کو اکثر پولیس یا فوج کے ساتھ ان علاقوں میں گشت کرنا پڑتا تھا۔ ایک دن ایک گورے سارجنٹ نے نرمل سے کہا۔

"تم کانگریسی پاکستان نہیں چاہتے، پھر بھی اس وقت بمبئی میں پاکستان

قائم ہے یا نہیں؟"

اگلے دن ایک انگریز نامی نے نرمل اور اس کے ساتھی رپورٹروں سے کہا۔

"تم لوگ تو کوئٹ انڈیا کا نعرہ لگانے تھے نا؟ ہم سے کہتے تھے نکل جاؤ ہندستان چھوڑ دو۔ اب ہم چھوڑنے کو تیار ہیں تو کیوں ہماری خوشامد کرتے ہو کیوں ہمارے پیچھے پیچھے بھاگتے ہو؟ ہماری حفاظت کا مطالبہ کرتے ہو؟ ہندو کہتے ہیں ہمیں مسلمانوں سے بچاؤ، مسلمان کہتے ہیں، ہمیں ہندوؤں سے بچاؤ، پر دونوں ہماری حفاظت، ہماری توپوں اور بندوقوں کے محتاج ہیں۔ دونوں کہتے ہیں Quit India اور نرمل کو ایسا معلوم ہوا جیسے ہندستان کی آزادی کا محل اڑا دھم کر کے گر پڑا ہو۔ جیسے پچھلے سو برس کی تمام قومی روایتیں ایک ملبے میں مٹی میں مل گئی ہوں ... ... ترک موالات اور تحریک خلافت۔ سودیشی اور بائیکاٹ۔ جلیانوالا باغ کی قربانی۔ گاندھی جی اور علی برادران۔ بھگت سنگھ۔ ستیاگرہ اور سول نافرمانی ... ... تمام نعرے اور قومی گیت۔ ہندستان کا اتحاد اور ہندستان کی عزت اور آبرو ... ... آرٹ اور ادب۔ موسیقی اور شاعری اور مصوری ... ... ہر چیز مٹی میں مل گئی ہو۔

"مٹی میں مل کر بھی اس کندن کی چمک نہیں گئی"۔ گائیڈ بک رہا تھا۔

"اجنتا، ہندستان کے آرٹ اور ادب، موسیقی اور شاعری اور مصوری کا لافانی شاہکار ہے" بھارتی کہہ رہی تھی۔

مگر نرمل کو اس اندھیرے غار میں بجلی کی پیلی پیلی روشنی کے گھیرے میں بھی سوائے پھیکے پھیکے رنگوں کے چند بے معنی دھبوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ نہ حسن نہ آرٹ۔ نہ معنی، نہ مقصد۔ بجائے احساس حسن کے اس کا دل ایک عمیق غصے۔ ایک بے پناہ نفرت سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ چلّا اٹھتا۔

"یہ سب کیوں؟ ... ... یہ ہزاروں آدمیوں کی ہزاروں برس کی محنت۔ کیوں؟ اور کس لئے؟ ... ... یہ پہاڑ کی گود سے تراشے ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی، یہ مصوری ــــ کیوں؟ اور کس لئے؟ ... ... بے کار ہیں یہ سب۔ یہ ساری محنت بے کار تھی۔ دنیا کے لاکھوں برس کے ارتقا میں ایک لغو اور مضحکہ خیز لمحہ ... ... بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گلکاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تاکہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے ... ... اجنتا سے ہندستان نے نہ کچھ سیکھا ہے اور نہ سیکھے گا۔ یہ غار دنیا سے، اصلیت سے سچائی سے فرار کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اجنتا نہ صرف بے کار ہے بلکہ ایک زبردست جھوٹ ہے۔ دھوکا ہے، فریب ہے ... "

گائیڈ نرمل کے خوفناک خیالات کی رو سے بے خبر اپنی رو میں رواں کئے جا رہا تھا۔

"یہ دیکھئے مہاتما بدھ گھوڑے پر چڑھے بازار میں سے گزر رہے ہیں ان کے چہرے پر کتنی شانتی ہے ــــ اور دیکھئے یہ عورتیں اپنے اپنے

گھروں پر سے ان کو کتنی معتقدانہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں ... "

اور بھارتی کہہ رہی تھی۔

" نرمل دیکھو، ان عورتوں کے چہروں پر کتنی حسین وجدانیت طاری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندستانی عورتوں کی اصلی روح، ان کی شانت آتما، ان کی نزاکت اور ان کی مامتا کو کچھ اجنتا کے آرٹسٹ ہی سمجھے ہیں ... ... "

ہندستانی عورتوں کی اصلی روح، ان کی شانت آتما، ان کی نزاکت، ان کی مامتا!

نرمل کا جی چاہا کہ قہقہہ مار کر اتنے زور سے ہنسے کہ غاروں کی پتھریلی دیواریں لرز اٹھیں، یہ چٹانیں تھرا جائیں، یہ غاروں کا سلسلہ اس کے نعرۂ حقارت سے گونج اٹھے۔

ہندستانی عورتوں کی اصلی روح! ان کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!! اُن کی مامتا!!!!

جھوٹ۔ سراسر جھوٹ۔ دھوکا۔ خود فریبی۔

نرمل نہ کمیونسٹ تھا اور نہ کمیونسٹوں سے ہمدردی رکھتا، مگر ایک دن وہ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں پارٹی سکریٹری پورن چندر جوشی کا بیان لینے گیا تھا کہ یکایک سڑک کی طرف سے کچھ شور کی آواز آئی اور سب کھڑکیوں کی طرف بھاگے۔ جھانک کر دیکھا تو ایک بوڑھا سفید داڑھی والا بوری مسلمان اپنے خون میں لت پت سڑک کے بیچوں بیچ پڑا آخری سانس لے رہا تھا۔ اور ساتھ کے مکان کی بالکنی پر اور اس کی نچلی منزل کی دہلیز پر مرہٹہ عورتوں کا ایک گروہ

کھڑا ہنس رہا تھا جیسے کوئی نہایت دلچسپ اور مزے دار تماشہ ہو رہا ہو۔

ہندستانی عورتوں کی اصلی روح! ان کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ممتا!!!!

ایک ریڈ کراس کی موٹر آئی، اور بوڑھے پوربی مسلمان کی لاش کو اٹھا کر لے گئی۔ اور سامنے والے مکان میں سے ایک مرہٹہ عورت بالٹی ہاتھ میں لٹکائے نکلی اور جہاں بوڑھے کا خون گرا تھا وہاں نہایت اطمینان سے پانی بہا کر سڑک کو دھو گئی اور کئی روز نرمل کے کانوں میں ان عورتوں کے قہقہے ایک خوفناک شور بن کر گونجتے رہے۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس بوڑھے کی سفید داڑھی جو خود کے خون سے رنگین ہو گئی تھی، ایک بھیانک بگولہ بن کر پھڑپھڑاتی رہی۔ اور اسے ایسے معلوم ہوا کہ تمام ہندستان کی عورتیں کسی ایسے خوفناک اور خونیں مذاق پر ہنس رہی ہیں جو اس کی سمجھ سے باہر ہے۔

ہندستانی عورتوں کی اصلی روح! ان کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ممتا!!!!

نرمل کے بہت سے دوست مسلمان تھے مگر فساد کے دنوں میں وہ ان کے محلوں میں نہیں جا سکتا تھا۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ اس کے ساتھی رپورٹر اور دوست حنیف کو سخت بخار اور سرسام ہو گیا ہے۔ نرمل سے نہ رہا گیا اور بھنڈی بازار پہنچ ہی گیا۔ جہاں ایک چال میں حنیف اکیلا رہتا تھا۔

کرافورڈ مارکیٹ پر سوائے نرمل کے تمام ہندو بس سے اتر گئے۔ وہ خود کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھا اور اس کی وضع قطع سے یہ ہرگز نہ معلوم ہوتا تھا

کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان یا عیسائی۔ رنگ گورا ہونے کی وجہ سے بعض تو اسے پارسی ہی سمجھتے تھے مگر پھر بھی جوں جوں بس بمبئی کے "پاکستانی" علاقے میں جا رہی تھی اس کا دل خوف اور پریشانی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک بار تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے برابر بیٹھا ہوا ہٹا کٹا "غنڈہ نما" مسلمان نوجوان اس کے دل کی دھڑکن سن کر سمجھ جائے گا کہ وہ ہندو ہے اور اپنی جاکٹ میں سے چھرا نکال کر اس کی کمر میں گھونپ دے گا۔ اسی طرح جیسے چرنی روڈ پر اس دبلے پتلے نوجوان کو ایک ہندو غنڈے نے "مشٹیک" سے مار ڈالا تھا۔ اور دفعتاً نہ جانے کیوں اس کی کمر میں ریڑھ کی ہڈی کے پاس کھجلی سی محسوس ہونے لگی اور ایک خیالی چاقو کا تیز پھل اس کی پسلیوں میں پیوست ہوتا گیا۔

بائیلی والا اسپتال کے پاس وہ بس سے اتر کر پٹری پڑی چلا تو اسے چاروں طرف قاتل ہی قاتل نظر آئے۔ وہ چابڑی والا جو کیلے اور موسمبیاں بیچ رہا تھا نہ جانے وہ کس وقت اپنا ترکاری کاٹنے کا چاقو ایک ہندو کی کمر میں پیوست کر دے۔ وہ خوفناک لال داڑھی والا پٹھان تو ضرور ایک "کافر بچے" کی تلاش میں ہوگا۔ پشت سے پتھریلی سڑک پر کھٹ کھٹ قدم قریب آتے ہوئے سنائی دیئے۔ نرمل نے گھبرا کر مڑ کر دیکھا۔ کوئی برقعہ پوش عورت تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ دفعتاً اسے خیال آیا کہ اس برقعہ میں کوئی "غنڈہ" ہی چھپا ہوا ہو۔ اور وہ تقریباً دوڑتا ہوا حنیف کی چال کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

حنیف سرسامی کیفیت میں بے ہوش پڑا تھا۔ نرمل کو اس کے پاس

شام تک ٹھہرنا پڑا۔ جب حنیف کی حالت کسی قدر بہتر ہوئی اور اس نے واپس جانے کا ارادہ کیا، اسی وقت ایک سپاہی "بھونپو" میں پکارتا ہوا وہاں سے گزرا کہ شام کے پانچ بجے سے کئی علاقوں میں چوبیس گھنٹوں کا کرفیو لگا دیا گیا ہے کوئی گھر سے نہ نکلے کیوں کہ گشتی فوجیوں کو سر راہ چلنے والوں پر گولی چلانے کے احکامات دیدیئے گئے ہیں۔ نرمل نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے میں دس منٹ تھے اتنی دیر میں اس کا سٹیو اجی پارک پہنچنا ناممکن تھا۔ چارو ناچار اس نے رات حنیف کے کمرے میں گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔

حنیف کا کمرہ کنارے پر تھا۔ ایک کھڑکی میں سے بڑی سڑک نظر آتی تھی، دوسری ایک گلی میں کھلتی تھی۔ سڑک پر بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی جلد سے جلد اپنے گھر پہنچنے کی فکر میں تھا۔ نرمل نے دیکھا کہ ایک پوربی "دودھ والا بھیا"، جس کی لمبی چوٹی دور دور سے پکار کر کہتی ہے کہ "میں ہندو ہوں"، کندھے پر بہنگی جس میں دو دودھ کی گڑویاں رکھی ہوئی ہیں۔ سراسیمہ نظروں سے اِدھر اُدھر آگے پیچھے دیکھتا ہوا چلا آرہا ہے۔ اور اس چرنی روڈ والے واقع کی طرح نرمل کا پھر بے اختیار جی چاہا کہ چلا کر "دودھ والے بھیا" کو خطرے سے آگاہ کردے۔ مگر اس بار پھر الفاظ اس کی زبان پر جم کر رہ گئے اور چشم زدن میں تین تگڑے تہمد بند جوانوں نے اس دبلے پتلے کالے پوربی کو گھیر لیا۔

"کہاں جاتا ہے بے کافر کے بچے؟"

دودھ والے بھیا کی گھگھی بندھ گئی۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ شاید اسے ان تینوں کی آنکھوں میں اپنی موت نظر آئی۔ وہ واپس مڑا۔ اُدھر بھی غنیم کا ایک

گروہ کھڑا ہوا اس کی طرف قاتلانہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ ایک ہرن کی طرح جو ہر طرف شکاریوں سے گھِر گیا ہو۔ اس نے ایک لمحے کے لئے مایوس آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دفعتاً وہ اس گلی کی طرف بھاگا۔ اور اس کے تعاقب میں پانچ شکاری گئے! ———

نرمل بھاگ کر گلی والی کھڑکی کی طرف گیا۔ مگر ابھی وہ اُدھر پہنچ نہ پایا تھا کہ دودھ والے بھیا کے خود اپنی بہنگی میں اُلجھ کر گرنے کی آواز آئی۔ پیتل کی گگریاں ایک جھنکار کے ساتھ سڑک پر اوندھ گئیں اور ان کا دودھ ایک سفید نہر بن کر بہہ نکلا۔ جب نرمل نے کھڑکی میں سے دیکھا تو اس سفید دودھ میں پوربی کا سرخ خون مل چکا تھا۔

"بھاگ کر جاتا تھا سالا"۔

اور پھر نرمل نے برابر کے کمرے سے کسی عورت کے ہنسنے کی آواز سنی۔

"اری او گل بانو۔ دیکھ تو سہی۔ ایک کافر ہماری گلی میں مارا گیا ہے"...

... جیسے کوئی کہہ رہا ہو — "اری او گل بانو! مبارک ہو، ہماری گلی والوں نے آج کتنی بہادری کا کام کیا ہے!" ... ... اور پھر تین چار جوان، ادھیڑ، بوڑھی عورتوں کی خوشی سے بھری ہوئی آوازیں۔

"اری اس کی چٹیا تو دیکھ"۔

"اچھا ہوا۔ یہ سب پوربیے دودھ میں برابر کا پانی ملاتے ہیں۔ اب سزا ملی ہے"

"گڑگام میں جو مسلمان مارے ہیں ہمارے آدمی بھی ان میں سے ایک ایک کا بدلہ لیں گے "

اور پھر ان ہی میں سے کوئی عورت اندر گئی۔ اور گھر بھر کا کوڑا ترکاری کے چھلکے، انڈوں کے خول، گوشت کے چھچھڑے اور ہڈیاں، گلی میں لوٹ دیا۔ عین وہاں جہاں مکھیوں نے پوربی بھیا کے دودھ اور خون پر بھن بھنانا شروع کر دیا تھا۔

ہندستانی عورتوں کی اصلی روح! ان کی آتما! ! ان کی نزاکت!!! ان کی ممتا!!!

سینڈھرسٹ روڈ والی عورتوں اور بھنڈی بازار والی عورتوں کے خونی قہقہے مل کر نرمل کے لاشعور پر ایک مہیب گونج بن کر چھائے ہوئے تھے وہی گونج اسے اب تک اجنتا کے ان غاروں میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ دھندلی پھیکی رنگ کی تصویروں میں اسے ہر دیوی ہر اپسرا، ہر راج نرتکی، ہر عورت کے چہرے پر ایک شیطانی خوشی اور اس کی آنکھوں میں ایک قاتلانہ چمک نظر آئی۔ اور نرمل کا دل ایک عمیق نفرت سے بھر گیا۔

"میں ہر عورت سے نفرت کرتا ہوں"۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "ہر عورت سے۔ یہاں تک کہ بھارتی سے بھی —— بھارتی —— جو اس سے محبت کرتی تھی اور جس سے مدت سے وہ بھی محبت کرتا تھا۔ بھارتی جو نرمل کو اور اس کی حساس طبیعت کو اپنی دولت کی پناہ میں رکھنا چاہتی تھی۔ جو بمبئی اور اس کے کشت و خون کے ماحول سے نرمل کو تقریباً زبردستی بھگا کر اجنتا لے آئی تھی۔

محبت - نفرت - نفرت - محبت - ہم بھائی بھائی ہیں - ہم عاشق و معشوق ہیں - ہم دوست اور ساتھی ہیں - ہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے رشتے میں منسلک ہیں، مگر ہم ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں - ہم ایک دوسرے کی کمر میں چھرا گھونپتے ہیں - ہم ایک دوسرے پر پتھر پھینکتے ہیں - ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں - ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں ... ...

"دیکھئے - یہ لاشیں دیکھئے - سر الگ اور دھڑ الگ"

گائیڈ اپنی رو میں کہے جا رہا تھا - بولتے بولتے اس کو پسینہ آگیا تھا مگر اس کی آواز نہ تھکتی تھی ——— اور بھارتی ——— نازک، نفاست پسند، حساس نرم دل بھارتی ——— غار کی دیوار پر تصویر ہی میں لاشیں دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا تھا -

"اس ظالم راجہ نے سب کو قتل کرا دیا ہے - سر کٹوا کر لاشیں اس گڑھے میں پھنکوا دی ہیں - چیلوں گدھوں کے کھانے کے لئے ... ..."

اور نرمل کے دماغ میں یہ غیر متعلق خیال رینگتا ہوا چلا آیا کہ دراصل راجہ ظالم نہیں تھا بلکہ شاید اسے گدھوں چیلوں کا بڑا خیال تھا - ان کو خوراک بہم پہنچانے کے لئے اس نے ان سب لوگوں کو مروا کر ان کی لاشیں یہاں ڈلوائی تھیں - اس کے ظلم میں کم سے کم مردار خور جانوروں کا تو بھلا تھا ... ...

لاشیں! ... ...

سائیں ٹھنڈی، مسخ شدہ کالی اور نیلی لاشیں، جو ٹھنڈے پتھر کے فرش پر اس طرح بکھری ہوئی پڑی تھیں - جیسے فصل کٹنے کے وقت کسی کسان

نے گیہوں کی بالیں کاٹ کر کھیت میں چھوڑ دی ہوں ... ... جیسے مذبح خانے میں ستائیس بکروں کی کھال اتار کر ایک قطار میں لگا رکھا ہو ... ... جیسے ... ... جیسے ستائیس انسانی لاشیں بکھری ہوئی ہوں!

نرمل اخبار کے لئے رپورٹ لینے اسپتال گیا تھا اور وہاں اسے پتہ چل گیا کہ کس کمرے میں فساد کے مقتولین کی لاشیں پوسٹ مارٹم اور کورونر کے فیصلے کے لئے رکھی گئی ہیں۔ اس نے عمر بھر میں صرف ایک بار ایک لاش میڈیکل کالج کے سرجری وارڈ میں رکھی ہوئی دیکھی تھی۔ تب بھی تین وقت اس سے کھانا نہ کھایا گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی مردہ آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہی تھیں، مگر یہاں ایک لاش نہیں ستائیس لاشیں رکھی تھیں۔ بوڑھے۔ جوان۔ بچے۔ سوکھے ہوئے جسم۔ کسی کی کمر میں گھاؤ۔ کسی کی آنتیں پیٹ سے باہر نکلی ہوئی۔ کسی کی گردن سے سر جدا۔ دھڑ کے قریب رکھا ہوا۔ کسی کا بھیجا پھٹے ہوئے سر میں سے باہر اُبلتا ہوا۔ ان میں سے کون ہندو تھا؟ اور کون مسلمان؟ موت کی برادری میں سب ایک تھے۔ قاتل کی چھری نے سب کو برابر برابر لٹا دیا تھا۔ یہ ٹھنڈا پتھریلا فرش۔ یہ تھا ان کا پاکستان اور ان کا ہندوستان۔ یہ بیکار موت۔ یہ پتھرائی ہوئی آنکھیں۔ یہ سناٹا۔ یہ بیچارگی ــــــ یہ تھی ان کی آزادی۔ یہ تھا ان کا اسلام اور یہ تھا ان کا ویدک دھرم ــــــ جے جے مہادیو ــــــ اللہ اکبر!

نرمل عملی سیاست سے ہمیشہ دور بھاگتا تھا۔ علاوہ اخبار کے کام کے جو وہ پیٹ کی خاطر کرتا تھا وہ عمل کے میدان کا دھنی نہیں تھا۔ اس کی دنیا خیالات اور محسوسات کی دنیا تھی۔ پھر بھی فسادات شروع ہونے کے تیسرے

دن ہی وہ اپنے محلے کے شانتی دل میں شامل ہو گیا تھا۔ اور شاید اس لئے کہ اس کا تعلق ایک اہم روزنامہ اخبار سے تھا۔ اور شانتی دل ہو یا سیوا سماج ہو یا خدامِ وطن، ہر پبلک جماعت کو پبلسٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو کمیٹی کا ممبر بھی چن لیا گیا تھا۔ نرمل کا دوست اور ہمسایہ احمد جو ایک دوسرے اخبار میں سب اڈیٹر تھا۔ وہ بھی کمیٹی کا ممبر چُن لیا گیا تھا۔ اس لئے کہ تمام شیواجی پارک کے علاقے میں وہی صرف اکیلا مسلمان تھا جو شانتی دل میں شامل ہوا تھا اور ایسی کمیٹیاں سرکاری منظوری نہیں حاصل کر سکتیں جب تک ان میں سب فرقوں کے نمائندے موجود نہ ہوں۔

چند روز تک نرمل شانتی دل کی تنظیم کے کام میں مستغرق رہا۔ اور اُسے ایسا معلوم ہوا کہ فساد کے اثر سے اس پر جو ایک مہلک جمود اور گھٹے گھٹے غم اور بے بسی کی حالت طاری ہو گئی تھی۔ وہ اب جاتی رہے گی۔ شانتی دل میں شامل ہو کر اس کو وہی وجد آفریں مسرت حاصل ہوئی جو ایک سپاہی کو طبل جنگ سن کر ہوتی ہے یہ جنگ تاریکی اور روشنی کے درمیان تھی۔ غارت گری اور امن کے درمیان۔ وہ اس جنگ میں ایک سپاہی تھا۔ وہ شیطانی تعصبات اور درندگی کے خلاف جہاد میں شریک تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس جنگ میں کوئی کارہائے نمایاں نہ کر سکے مگر کم سے کم اس کو یہ تسلی تو تھی کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے، کہ اس کی زندگی بالکل بیکار، بے معنی، اور بے مقصد تو نہیں ہو گئی ہے۔

بھارتی نے کئی بار نرمل سے کہا

”چلو بمبئی سے باہر کہیں چلے چلیں۔ جب فساد ختم ہو جائے گا۔ تب آ

جائیں گے۔"

آگرہ، دہلی، کشمیر، اجنتا، ایلورہ، میسور، سیلون۔ نہ جانے کہاں کہاں جانے کا لالچ دلایا، مگر نرمل کو ایسے وقت بمبئی چھوڑ کر باہر جانا پرلے درجے کی کم ہمتی اور بزدلی معلوم ہوئی۔ بھارتی نے لاکھ سمجھایا کہ اس جیسے حساس آرٹسٹ کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا، اس کی خداداد ذہانت کی تحقیر تھی۔ مگر وہ نہ مانا۔ اور سوائے دفتر کے اوقات کے سارے دن اور رات کا بیشتر حصہ شانتی دل کے کام میں صرف کرتا رہا۔

شانتی دل کا کام ؟ نرمل سمجھا تھا کہ اس کا کام واقعی شانتی کا پرچار ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ شانتی دل کے ممبر گھر گھر جائیں گے اور لوگوں کو امن اور شانتی سے رہنے کی تلقین کریں گے، آپس کی فرقہ وارانہ منافرت کو دور کر کے یگانگت اور اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ شہر میں خود ان کے علاقے میں ہر دم ہر قسم کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ماہم کے مسلمان شیواجی پارک کے ہندوؤں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ شیواجی پارک کے ہندو ماہم کے مسلمانوں پر حملہ کرنے والے ہیں، ہندو دودھ والے دودھ میں زہر ملا کر مسلمانوں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں، مسلمان ترکاری والے بینگنوں اور موسمبیوں میں زہر کے انجکشن دے کر ہندوؤں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں۔ ایرانی ہوٹلوں کی چائے مت پیو، اس میں زہر ہے۔ ہندو حلوائی کی مٹھائی مت کھاؤ، اس میں زہر ہے! ــــ جھوٹ، جھوٹ جھوٹ، جھوٹ، اور تعصب اور نفرت کا ایک طوفان جس میں تمام شہر ڈوبا جا رہا تھا۔ نرمل اور اس کے دوست احمد کو امید تھی کہ شانتی دل کا پہلا کام ہوگا اس

خونی سیلاب کو روکنا۔ مگر جلد ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

شانتی دل کا پہلا کام۔ چندہ جمع کرنا ... ... احمد کے ساتھ نرمل ہر کسی کے ہاں گیا۔ گنتی کے جو چند مسلمان تھے انھوں نے مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

"یہ شانتی دل کے پردے میں ہندو کیا کر رہے ہیں، ہم خوب جانتے ہیں ... ... ہم نے بھی اپنی حفاظت کے لئے پٹھان رکھ لئے ہیں ..."

بعض ہندوؤں نے کہا۔

"آپ کے نہتے والنٹیر ہماری حفاظت کیا خاک کر سکتے ہیں؟ ۔ ہم سکھ دربان رکھ رہے ہیں ۔" اور پھر رازدارانہ لہجے میں ۔ "سکھ کرپان رکھ سکتے ہیں، کیا سمجھے"

خیر۔ چندہ جمع کیا گیا۔ بیس پہرے دار پچاس پچاس روپے ماہوار پر ملازم رکھے گئے۔ کمیٹی میں مسئلہ در پیش ہوا کہ ان کو کہاں کہاں ڈیوٹی پر لگایا جائے۔

"ایک ایک آدمی ہر سڑک کے ناکے پر لگایا جائے"

"نہیں۔ یہ حماقت ہو گی۔ حملہ صرف تین طرف سے ہو سکتا ہے، یا ماہم کی طرف سے، یا دادر کی طرف سے یا سمندر کی طرف سے، صرف ان ناکوں پر پہرہ لگانا چاہئے۔"

"حملہ؟ ۔ کس کا حملہ"

"مسلمان اگر حملہ کریں گے تو اور کدھر سے حملہ کریں گے؟"

"پر ان پہرے داروں کا کام کیا ہو گا؟"

"ان سے کہہ دیا جائے کہ جیسے ہی کسی مسلمان غنڈے کو دیکھیں سیٹی بجا دیں تاکہ چاروں طرف سے لوگ جمع ہو جائیں"۔

"صرف مسلمان غنڈے؟ اور اگر ہندو غنڈے ہوں تو؟"

نرمل نے یہ سوال کیا تو، مگر وہ احمد سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔

کمیٹی کے جلسے کے بعد اس نے احمد سے کہا۔

"یہ تمھاری ہی ہمت ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کام کر سکتے ہو مجھے تو یہ سب مہاسبھائی معلوم ہوتے ہیں"

احمد نے کہا۔

"ایسے بیوقوفوں اور جاہلوں کی کمی دونوں طرف نہیں ہے۔ تم نہیں جانتے کہ ماہم کے مسلمانوں میں کیا کیا افواہیں مشہور کی جا رہی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شیوا جی پارک میں شانتی دل کے نام سے ہندوؤں کی ایک فوج تیار کی جا رہی ہے جو بہت جلد ماہم کے مسلمانوں پر شب خون مارے گی"۔

چندہ۔ والنٹیر۔ محافظ۔ وردیاں۔ سیٹیاں۔ جلسے۔ رزولیوشن۔ پولس کمشنر کے نام عرضیاں۔ مگر شانتی کا پرچار؟ اتحاد کا پروپگنڈا؟ ان کا نام نہیں۔ تو پھر شانتی دَل کا مقصد؟ اس دوڑ دھوپ سے فائدہ؟ مسلمان غنڈے ——— ہندو غنڈے ——— گھروں میں پتھر جمع کر کے رکھو"، "میں نے تو دس لاٹھیاں چھپا رکھی ہیں۔ میرے ہمسائے کے پاس پستول ہے"۔ شانتی! شانتی!! شانتی!!!

"یہ شانتی کا مہاساگر ہے، نرمل"۔ بھارتی کہہ رہی تھی "اگر ہم آٹھ

دس دن تک روز یہاں آکر کئی گھنٹے گزارا کریں تو مجھے یقین ہے کہ تمھارے بے چین دل کو ضرور شانتی ملے گی "

اور گائیڈ کہہ رہا تھا۔

" آپ نے سب غار دیکھ لئے ہیں - اب ایک باقی رہ گیا ہے۔ مگر اس میں آپ کو دوسرے غاروں کی طرح سنگتراشی اور مصوری کے نادر اور حسین نمونے نہیں ملیں گے۔ چھت، ستون، فرش، ہر چیز نامکمل ہے - اس غار کا کام ادھورا رہ گیا ہے ... "

" ادھورا کام! وہ ——— نرمل ——— بھی تو بمبئی میں اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ بلکہ ادھورے سے بھی کم ——— ابھی جنگ شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے ہار مان لی تھی۔

شانتی دل کمیٹی کا آخری جلسہ۔

نرمل نے شروع ہی سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بجائے معمولی اَن پڑھ اور اجڈ دربانوں اور چوکیداروں کے آزاد ہند فوج کے سابق سپاہیوں کو معقول مشاہرے پر حفاظت کے لئے رکھا جائے کیونکہ وہ فرقہ وارانہ تعصبات سے پاک اور بالا تھے ان میں قومی خدمت کا جذبہ تھا اور وہ اپنی پہلی خدمات اور قربانیوں کی وجہ سے مدد کے مستحق تھے۔ شانتی دل کے سیکریٹری نے اس جلسے میں بیان کیا کہ پرانے تمام پہرے دار علیحدہ کر دیئے گئے ہیں اور ان کی بجائے چند آزاد ہند فوج کے سابق سپاہی رکھ لئے گئے ہیں - یہ سن کر نرمل کا حوصلہ بڑھ گیا - اسے ایسا معلوم ہوا کہ اب شانتی دل کا کام صحیح طریقے پر ہو گا۔ مگر ایک لمحے ہی میں اس کی امیدوں

پر پانی پھر گیا۔

ایک بوڑھے مرہٹہ وکیل نے سوال کیا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ آزاد ہند فوج کے ان سپاہیوں میں مسلمان بھی ہیں؟"

سیکریٹری نے کہا۔

"ہاں، مگر صرف ایک"

ایک موٹے گجراتی سیٹھ نے کہا۔

"میرے حلقے میں اس بات پر بڑی بے چینی پھیلی ہوئی ہے"

ایک دبلے سوکھے مارواڑی نے کہا۔

"یہ تو عجب کی بات ہے"

بوڑھے وکیل نے اونچی آواز میں کہا۔

"میں سیکریٹری صاحب سے اس معاملہ میں جواب طلب کرتا ہوں کہ کیوں ایک مسلمان کو رکھا گیا"

گجراتی سیٹھ نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"اگر ایسا ہوگا تو ہم لوگ ایک پیسہ چندہ نہیں دیں گے"

ایک پستہ قد ڈاکٹر نے کہا۔

"میرے حلقے کے لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر مسلمان ..."

دبلے سوکھے مارواڑی نے کہا۔

"یہ ہماری استریوں کی اِجّت کا سوال ہے"

بوڑھے وکیل نے کہا۔

"میں جواب طلب کرتا ہوں ... ..."

پریسیڈنٹ نے کہا۔

"خاموش۔ خاموش"

سکریٹری نے کہا۔

"میں تو اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ آزاد ہند فوج میں ہندو مسلمان کی تفریق نہیں کی جاتی۔ لیکن اگر کمیٹی کی رائے یہی ہے تو ہم کسی بہانے سے اس مسلمان سپاہی کو علیحدہ کر سکتے ہیں"

سب نے بیک وقت شور مچایا۔

"ہاں ہاں"۔ "فوراً" "ایک دم" ۔"اس کو رکھا ہی کیوں؟"۔ صرف احمد خاموش بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

نہ جانے کیوں احمد کو اطمینان سے مسکراتے دیکھ کر نرل کے صبر کا پیمانہ دفعتاً لبریز ہو گیا۔ اس کے دماغ کے اندر کی کوئی کل دفعتاً تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔

"نہیں، نہیں!!"۔ وہ غیر معمولی جوش سے چلایا۔ سیکریٹری جو جلسے کی روئداد میں یہ الفاظ لکھنے میں مصروف تھا کہ "یہ تجویز بلا مخالفت پاس کی گئی کہ آزاد ہند فوج کے جن سابق سپاہیوں کو حفاظت کے لئے رکھا جائے، ان میں کوئی مسلمان نہ ہو ... ..." اپنی کرسی سے تقریباً اچھل پڑا۔ اس کے ہاتھ سے قلم گر پڑا اور سفید کاغذ پر جہاں اس تجویز کے الفاظ لکھے گئے تھے وہاں روشنائی کا ایک بڑا دھبہ پڑ گیا ... ..."

"نہیں! نہیں!! نہیں!!!" جیسے اس ایک لفظ کو دس بار دہرانے سے باقی دس ممبروں کی رائے منسوخ ہو جائے گی، "میں ایسی تجویز کی کبھی کسی حالت میں بھی موافقت نہیں کر سکتا"

نرمل کے الفاظ کی والہانہ شدت نے چند لمحوں کے لئے سب کو خاموش کر دیا۔ مگر اس خاموشی میں اسے اپنی آواز کھوکھلی اور بے معنی معلوم ہوئی۔ "ایسی تجویز ہمارے لئے باعث شرم ہوگی۔ ہم شانتی اور اتحاد کے نام لیوا ہیں۔ مگر ہم خود بدترین فرقہ وارانہ تعصب کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اگر یہ تجویز پاس ہوئی تو میں اس معاملہ کو پولیس اور پبلک کے سامنے رکھنا اپنا فرض سمجھوں گا"

اور احمد مسکرائے جا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔

"شاباش، بچے۔ مگر یہ سب بے کار ہے"

دبلے مارواڑی نے مخالف اول کی حیثیت سے کہنا شروع کیا۔

"مسٹر نرمل کو نہیں معلوم کہ ہم ہندو کتنے خطرے میں ہیں۔۔۔"

گجراتی سیٹھ نے کہا۔

"ہم تو صاف بولیں گے۔ اگر مسلمان رہے گا تو ہم چندہ نہیں دیں گے"

پستہ قد سیٹھ نے کہا۔

"ہم استعفیٰ دے کر ہندو مہا سبھا کے سورکشن دل میں مل جائیں گے"

مگر چالاک بوڑھے وکیل نے دو ممبروں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرتے ہوئے نرمل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مسٹر نرمل ایک بات بتائیے۔ یہ ہندو علاقہ ہے۔ اگر یہاں پہرہ دینے

ہوئے اس بیچارے مسلمان سپاہی کو کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو کون ذمہ دار ہو گا ؟ - آپ" اور یہ کہہ کر اس نے گجراتی سیٹھ اور پستہ قد ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری - گویا کہہ رہا ہو کہ دیکھا میرا ڈانو ٹی پینترا - ایسے ایسے لونڈے میں نے بہت دیکھے ہیں ... "

احمد نے مسکرا کر نرمل کی طرف دیکھا اور نظروں ہیں کہا -

"میں نے کہا نہیں تھا کہ کوئی فائدہ نہیں ہے ... "

تجویز پاس ہو گئی - نرمل بھرا ہوا خاموش بیٹھا رہا - وہ بہت کچھ کہہ سکتا تھا - دعوے دلائل - منطق - سیاست - مگر اسے معلوم ہو گیا کہ اس تعصب اور جہالت کی دیوار پر سر پٹخنا لاحاصل ہے اس کے چاروں طرف آوازوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہا - تجویزیں پاس ہوتی رہیں، بحث مباحثے ہوتے رہے حسب معمول مختلف ممبروں اور عہدہ داروں میں سخت کلامی بھی ہوتی رہی، مگر نرمل نے نہ کچھ کہا نہ سنا -

اس کا دماغ خوفناک خیالات اور مناظر کا اسٹیج بنا ہوا تھا - کلکتہ - بمبئی احمد آباد - نواکھالی - بہار - قتل - خون - خون کی ندیاں - خون کے دریا - خون کا سمندر نفرت اور تشدد - تعصب اور نفرت - عورتوں کی بے حرمتی - بچوں کی لاشیں - لاشوں کے پہاڑ - ایک خونیں آسمان کی طرف لپکتے ہوئے ہزاروں شعلے ... اور ایک گلدار ہتھوڑے کی طرح یہ خیال اس کے دماغ پر چوٹ لگاتا رہا کہ یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ شیواجی پارک شانتی دل کے ممبر آزاد ہند فوج کے ایک مسلمان سپاہی کو اپنی حفاظت کے لئے رکھنے کو تیار نہیں ہیں ...

اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ آزاد ہند فوج کے شاندار تاریخی کارنامے بیکار

تھے ۔ تمام جنگ آزادی بے کار تھی ۔ تمام دیش بھگتوں اور شہیدان وطن کی قربانیاں بیکار تھیں ۔ تمام قومی نعرے ، تمام قومی تحریکیں ، تمام قومی لیڈر ، ہر شخص بیکار تھا ۔ ہر چیز بے کار تھی ۔ شیواجی پارک شانتی دَل بیکار تھا ۔ اس سلسلے میں نرمل کا کام بے کار تھا ۔ اس کا بمبئی میں رہنا بے کار تھا ۔ اس کی زندگی ہی بیکار تھی ... اس لئے کہ ہندو اور مسلمان کے ٹھپے آزادی اور ہندستان سے زیادہ اہم ثابت ہوئے تھے ۔

اُسے شانتی دل کمیٹی کے وہ سب ممبر اس وقت تعصب اور نفرت اور خطرناک جہالت کے دیوتا معلوم ہوئے جو اپنی آتشیں آنکھوں سے اس کو گھور رہے تھے ۔ جو اسے بھسم کرنے کے لئے اس کی طرف بڑھے آرہے تھے ۔ وہی دس نہیں ، بلکہ ہر طرف سے لاکھوں راکششوں کے دَل کے دَل اس کی طرف بڑھے آرہے تھے ۔ ان میں چوٹی والے بھی تھے اور داڑھی والے بھی ۔ ہندو بھی اور مسلمان بھی ، بنگالی بہاری ، مرہٹہ ، گجراتی ، پنجابی ، پوربی ، پٹھان اور سب اس کے خون کے پیاسے

” بھاگ “

نرمل کے دھڑکتے ہوئے دل نے اسے للکارا

” بھاگ “

اور نرمل نہ صرف جلسے کے ختم ہونے سے پہلے ہی شانتی دل کے دفتر سے بھاگا بلکہ اگلے دن بھارتی کے ساتھ بمبئی سے بھی بھاگ آیا ۔

” کہاں چلیں ؟ “ بھارتی نے پوچھا

” جہاں یہ قتل و خون نہ ہو ، جہاں اخبار نہ ہو ، ریڈیو نہ ہو ۔ جہاں ہندو نہ ہوں

مسلمان نہ ہوں، جہاں چاقو، چھریاں، برچھے، بھالے، تیزاب، غنڈے موالی نہ ہوں ... دُور —— دنیا اور زندگی سے دُور —— !"

اور بھارتی نے سوچ کر کہا۔

"اجنتا؟"

احمد نرمل کو چھوڑنے اسٹیشن پر آیا۔ گاڑی چلنے لگی تو اس نے کہا۔

"اچھا ہے، چند روز کے لئے تبدیل آب وہوا کر آؤ۔ مگر اگلے اتوار کو شانتی دل کا جلسہ ہے جس میں چند تجویزیں پیش کرنے والا ہوں، اس میں تمہاری موجودگی ضروری ہے"

اور جب نرمل نے کہا۔

"میں اب شانتی دل کے جلسے میں کبھی نہ جاؤں گا"

تو احمد نے چلتی ریل کے ساتھ بھاگتے ہوئے کہا تھا۔

"تم اس کام کو ادھورا چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے، نرمل"

"ادھورا کام!"

ہنہ۔ یہ اجنتا کے سنگ تراش اور مصور۔ یہ بھی تو اس آخری غار کو ادھورا ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ نہ جانے کیوں۔ کیا واقعہ پیش آیا کہ آٹھ نو سو برس تک درجنوں نسلوں کی مسلسل محنت کے بعد اس غار کو وہ ادھورا چھوڑنے پر مجبور ہو گئے؟

"تمہارا کیا خیال ہے، بھارتی ..."

پر بھارتی وہاں نہیں تھی۔ نہ گائیڈ تھا۔ کوئی نہیں تھا۔ نرمل کی آواز غار کی پتھریلی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی، غلام گردش میں گھوم کر پھر واپس لوٹ آئی۔

شاید وہ اس اندھیرے، ادھورے غار کے کسی کونے میں اپنے خیالات میں گم ہو گیا تھا، اور بھارتی اور گائیڈ یہ سمجھ کر باہر چلے گئے تھے کہ ممکن ہے وہ تنگ آ کر واپس چلا گیا ہو۔

اس کو اس غار میں گھومتے کافی عرصہ ہو گیا ہو گا کیونکہ دروازے کے باہر جو سامنے والی سرسبز پہاڑی نظر آتی تھی وہ کالی پڑ چکی تھی، شاید آفتاب غروب ہو چکا تھا ... ایک بڑھتی ہوئی گھٹن کی طرح غار میں اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔

نرمل باہر جانے کے لئے قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ اس نے ایک مشعل کو اپنی طرف آتے دیکھا اور وہ یہ دیکھ کر متحیر رہ گیا کہ جو کوئی بھی یہ مشعل لئے آ رہا تھا وہ غار کے تنہا دروازے سے داخل نہیں ہوا تھا بلکہ مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید گائیڈ اسے ڈھونڈتے ہوئے غار کے کسی دوسرے اندھیرے کونے میں چلا گیا ہو، اور اب لوٹ رہا ہو۔

مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مشعل ہاتھ میں لئے ہوئے جو آدمی گیروے رنگ کی کفنی پہنے ہوئے آیا تھا اس کو کسی کی تلاش نہیں تھی۔ اس نے ایک ادھورے ستون کے سہارے مشعل لگا دی اور اپنی کفنی کے کسی جھول میں سے ایک چھینی اور ایک ہتھوڑا نکال کر پتھر کو چھیلنے لگا۔

نرمل اس کی طرف بڑھنے والا ہی تھا کہ اس نے دیکھا کہ ویسی ہی گیروے رنگ کی کفنیاں پہنے، منڈے ہوئے سر کے درجنوں بھکشو مشعلیں لئے غار کے اندھیرے عقب میں سے نکلے چلے آ رہے ہیں۔

ان میں سے کسی نے بھی نرمل کی طرف توجہ نہیں دی۔ سب اپنی اپنی چھینیاں

اور ہتوڑے نکال کر چھت اور دیواریں چھیلنے یا ستونوں کو گول بنانے میں مصروف ہوئے۔ چند دیوار پر مٹی کا لیپ کر کے اس کی سطح ہموار بنا رہے تھے تا کہ جب دیوار اکھڑ جائے تو مصوّر اپنی تصویروں کے رنگین نقوش بنا سکیں۔ اور غار پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

چند منٹ تو نرمل اس پر حیرت منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس سے نہ رہا گیا۔ اور وہ اس سنگ تراش بھکشو کے پاس گیا جو سب سے پہلے غار میں داخل ہوا تھا۔

"معاف کیجئے، میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں، مگر مجھے آپ لوگوں کو مصروف دیکھ کر بڑا تعجب ہو رہا ہے"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں سمجھتا تھا کہ اس غار کی تعمیر ادھوری ہی ہے، اور یہ ادھوری ہی رہے گا"

"دنیا کی تعمیر بھی ادھوری ہے، انسان بھی ادھورا ہے۔ مگر ان کی تکمیل ہوتی ہی چاہئیے"

اس جواب کو نرمل کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔ پھر اس نے پوچھا

"آپ کب سے کام کر رہے ہیں؟"

"نو سو برس سے"

"نو سو برس؟ آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی عمر ... ..."

"میں اور مجھ سے پہلے میرا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ اور اس

سے پہلے اس کا باپ - ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور اس کے بعد تیسری نسل - آتما کے چکر کی طرح کام کا چکر تو چلتا ہی رہتا ہے "

"آپ کا نام ؟" نرمل نے بات چیت کو ذاتی رنگ دینے کی کوشش کی۔

"میرا نام ؟ کچھ نہیں۔ ہم سب بے نام ہیں"

اور نرمل کو یاد آیا کہ اس نے ان تمام غاروں میں کسی سنگ تراش یا کسی مصور کا نام کھدا ہوا یا لکھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

"پھر آپ کس لئے اتنا کام کرتے ہیں ؟"

"کام کسی غرض سے نہیں کیا جاتا۔ انسان کام سے اپنی پیدائش کا مقصد پورا کرتا ہے "

"تو یہ کام کب ختم ہو گا "؟

"کون جانتا ہے ؟"

"اس غار کو ... ... "

"پورا ہونے میں دو سو برس لگیں گے۔ اس کے بعد دوسرا غار، اور اس کے بعد تیسرا ... ... "

"تو کیا اجنتا کی تکمیل کبھی نہ ہو گی ؟"

"ہو گی ـــــ جب انسان کی تکمیل ہو گی "

نرمل کی شک پرستی اس کی حیرت پر غالب آ گئی، اور اس نے کسی قدر تلخی سے پوچھا۔

"مہربانی کر کے مجھے سمجھائیے کہ ہزاروں برس سے جو آپ جیسے ہزاروں آدمی اتنی محنت کر رہے ہیں یہ کیوں اور کس لئے؟ یہ پہاڑ کی گود سے تراشے ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی، یہ مصوری؟ یہ کیوں اور کس لئے؟

اس کی آواز میں تلخی کے بجائے جوش اور غصہ آ گیا۔

"بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گلکاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تاکہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے آپ لوگوں نے سنگتراشی اور مصوری کے یہ جادو گھر ہمیں دھوکا دینے کے لئے بنائے ہیں، یہ غار دنیا سے، اصلیت سے، سچائی سے فرار سکھانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔"

سنگتراش بھکشو کے چہرے پر ایک عجیب پرسکون مسکراہٹ تھی۔ جس میں تلخی کا شائبہ بھی نہ تھا، صرف محبت اور رحم اور عمیق ادراک۔ اس نے اپنے کام سے نظر ہٹائے بغیر سر ہلا کر نرمی سے کہا۔

"نہیں"

نرمل کو اس آدمی کی مسکراہٹ، اس کے صبر اور سکون پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔

"تو پھر اجنتا کا کیا مقصد ہے؟ اجنتا کا کیا پیغام ہے؟"

"سنو" — اور صرف اتنا کہہ کر وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ غار میں مکمل خاموشی تھی — صرف پتھر پر لوہا پڑنے کی آواز۔

نرمل منتظر رہا کہ بھکشو اس کو اجنتا کا فلسفہ، اجنتا کا پیغام سنائے گا، مگر

اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ صرف اس کی چھینی کی کھٹ کھٹ کھٹ اور پتھر کے پتلے پتلے پتر چھل کر فرش پر گرتے رہے۔

"تو کیا تم نہیں بتاؤ گے کہ اجنتا کا پیغام ...... ؟" مگر دفعتاً نرمل کے اندھیرے دماغ میں سمجھ کی ایک کرن چمکی، اور اس کی زبان پر جملہ ادھورا رہ گیا۔

غار میں مکمل خاموشی تھی، صرف پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز — یہی تھا اجنتا کا پیغام جسے وہ بھکشو نرمل کو سنانا چاہتا تھا۔

نرمل کی آنکھوں میں سمجھ کی نئی چمک دیکھ کر وہ راہب اپنی معصوم ادا سے مسکرا دیا، اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اور نرمل کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے دفعتاً دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ آب حیات۔ اکسیر۔ اس قیمتی نسخے کے سامنے ہر چیز ہیچ تھی۔ اُسے اجنتا کا پیغام مل گیا تھا۔

نہ جانے کب تک وہ اس غار کے کونے میں بیٹھا ہوا پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں کو سنتا رہا۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

اور ہر بار جب لوہے کی چھینی پتھر کی دیوار پر پڑتی تھی، نرمل کو معلوم ہوتا کہ وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے۔

عمل! عمل!! عمل!!! کام! کام!! کام!!! محنت! محنت!! محنت!!!

عمل سے پتھر موم کی طرح چھیلا جاتا ہے۔ عمل سے پہاڑ کی چٹانیں کاٹی جاتی ہیں۔ عمل سے پتھر میں گلکاری کی جاتی ہے۔ عمل سے تصویروں میں زندگی کا رنگ بھرا جاتا ہے۔ عمل سے انسان انسان بنتا ہے۔ عمل ہی عبادت ہے۔

عمل خود عمل کا انعام ہے ... ...

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ آج نہیں تو کل، سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں، یہ پتھر ضرور چھل کر، ترش کر سنگ تراشی اور مصوری کے نادر نمونے بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں، ہزاروں مل کر ان کو تراشیں گے۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام کو جاری رکھیں گی۔ یہ کام کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس کی منزل کمالِ فن ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ آج نہیں تو کل، سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں، انسان کی فطرت کے پتھر چھل کر، ترش کر حسن اور خوبصورتی، فن اور علم کے نادر نمونے ضرور بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں، ہزاروں لاکھوں، کروڑوں، تمام انسان مل کر ان کو تراشیں گے۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام کو جاری رکھیں گی۔ اس کی منزلِ تکمیل انسانیت ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ نرمل نے دیکھا کہ راہب اپنے کام میں اتنا مستغرق تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہتھوڑے کی چوٹ اس کے انگوٹھے پر پڑی۔ زخم سے لال لال لہو کی بوندیں ٹپک کر پتھریلی فرش پر گر رہی تھیں۔

اور دفعتاً نرمل کو وہ تمام تصویریں یاد آ گئیں جو اس نے ان تمام غاروں میں دیکھی تھیں۔ ہزاروں برس کے بعد بھی کتنے تازہ، کتنے شاداب تھے ان

کے رنگ۔ اور نہ جانے کیوں نرمل نے سوچا۔ کہ ان تصویروں کی لالی میں انسان کے خون کا رنگ ہے۔ جبھی تو وہ اتنی جیتی جاگتی ہیں۔ جبھی ان میں اتنی زندگی ہے ... ...

شاید وہ سو گیا۔ شاید وہ اپنے خیالات میں کھو گیا۔

جب اس کو ہوش آیا، تو غار طلوعِ آفتاب کی دھیمی دھیمی ترچھی کرنوں سے روشن ہو رہا تھا۔ مگر ہر طرف سناٹا تھا۔ نہ وہ سنگ تراش تھے نہ مصوّر۔ نہ مشعلیں۔

تو کیا اُس نے خواب دیکھا تھا؟ ... ... شاید ... ... کتنا عجیب خواب!

اس نے سوچا

"ہاں۔ خواب ہی ہو گا۔ رات بھر اس ماحول میں گزار کر کوئی تعجب نہیں کہ میرے تخیل نے ایک کیفیت پیدا کر دی ہو"

مگر باہر جاتے وقت جب وہ اس ستون کے قریب سے گزرا جس کو اس کے خواب والا راہب تراش رہا تھا، تو اس نے دیکھا کہ ستون پر ایک پھول کھدا ہوا ہے جو کل نہیں تھا۔ یا شاید یہ بھی اس کا واہمہ ہی ہو۔

پھر کچھ یاد آ کر اس کی نظریں فرش پر گئیں۔ وہاں سرخ موتیوں کی طرح تازہ خون کی کئی بوندیں پتھر پر بکھری ہوئی تھیں۔

نرمل بھارتی سے ملے بغیر اسٹیشن پہنچ گیا۔ اگلے دن اتوار تھا، اور اُسے شانتی دل کے جلسے میں احمد کی تجویزوں کی حمایت کرنے کے لئے

پہنچنا ضروری تھا۔ بمبئی سے، فساد سے، زندگی سے، کوئی فرار نہیں نہیں تھا۔

ریل میں ایک ہم سفر نے پوچھا۔
"آپ شاید اجنتا ہو کر آ رہے ہیں؟"
اور نرمل نے جواب دیا۔
"جی نہیں۔ میں اجنتا کی طرف جا رہا ہوں!"

# اندھیرا اور اُجالا

پرتھوی راج کپور کے نام

# پہلا ریل

(جس میں آپ ہیرو سے متعارف ہوتے ہیں)

کبھی اندھیرا۔ کبھی اُجالا۔

"بتی جلاؤ۔ بتی بجھاؤ"

"لائٹس آن۔ لائٹس آؤٹ"

"نمبر چوبیس"

"نمبر سترہ"

"مس شگنتلا کو ایک بے بی اور دو"

"چودہ نمبر اوپر لو"

"ستائیس نمبر کو ہارڈ کرو"

"ہارڈ اور ہارڈ۔ بس۔ بس۔ سوفٹ کرو۔ اور سوفٹ۔ بس!"

"نمبر اٹھارہ میں کپڑے کا ڈفیوزر ڈالو۔ نہیں نہیں سشیشے کا

ڈفیوزر "

"ریہرسل "

"کیمرہ ریڈی فور ریہرسل ؟"

"یس ریڈی - او کے "

"آل لائٹس "

اندھیرے کے سمندر میں سے روشنیاں یک وقت لپک کر باہر آئیں اور رات کا دن بن گیا۔ نہ صرف سیٹ کی تین دیواریں (بغیر چھت کی) بلکہ اسٹوڈیو کا کونا کونا جگمگا اٹھا۔

"ریہرسل !"

ساؤنڈ ٹرک کی سیٹی "خاموش ! خاموش !!"

ڈائرکٹر کی آواز "یس مس شکنتلا ؟ ریڈی دیپ کمار ؟"

"تو تم سچ مجھے جیون ساتھی بنانے کے لئے تیار ہو، رادھا ؟"

"یہ بھی پوچھنے کی بات ہے سندر ؟"

"ہاں رادھا - میں جیون کے جس راستے پر چل رہا ہوں وہ بڑا کٹھن اور بھیانک ہے - اس خارزار زندگی میں قدم قدم پر کانٹے ہیں - کیا اس راستے پر تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو ؟"

"ہاں سندر - تمہارے ساتھ چلوں گی تو راستے کے کانٹے بھی پھول بن جائیں گے "

"رادھا !"

"سندربا"

"ہاؤ از دیٹ؟"

ساؤنڈ ٹرک سے دو سیٹیاں،

"اوکے۔ لائٹس آف"

"اوکے۔ لائٹس آف"

"اوکے۔ ریڈی فار ٹیک"

"میک اپ"

"مس شکنتلا کی لپ سٹک ٹھیک کرو"

"دیپ کمار کی ناک چمک رہی ہے"

"ریڈی فار ٹیک"

"او۔ کے"

"فوکس"

"پانچ فٹ ساڑھے گیارہ انچ"

"لینز بدلو۔ سیونٹی فائیو لگاؤ"

"ساؤنڈ ریڈی؟"

"خاموش! خاموش! وی آر شوٹنگ!"

"آل لائٹس!" ... ...

بتی جلاؤ۔

بتی بجھاؤ۔

سٹوڈیو کے فرش سے چالیس فٹ کی اونچائی پر لوہے کے گاڈروں کے ایک گھانچے میں ایک فٹ بھر چوڑے لکڑی کے تختے کے سہارے لٹکا ہوا، ایک ہاتھ سے من بھر وزنی لائٹ کو سنبھالے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے رسی کو مضبوطی سے پکڑے، کندن کمار سوچ رہا تھا کہ کیا اس کی قسمت میں کبھی دیپ کمار کی طرح تین ہزار روپے ماہوار پانے والا ہیرو بننا نہ ہوگا۔ کیا اس کے سہانے سپنے ''ادھورے خواب'' بن کر ہی رہ جائیں گے؟ (اسے فلمی زبان میں نہ صرف بولنے بلکہ سوچنے کی بھی عادت پڑ گئی تھی) کیا وہ ہمیشہ بائیس روپے ماہوار پر لائٹ قلی کا کام ہی کرتا رہے گا؟ ۔

کندن کمار!

یہ اس کا پیدائشی نام نہیں تھا۔ اس کے باپ نے ٹونگر والے جوتشی جی کی صلاح سے اس کا نام سورج مل رکھا تھا۔ کیونکہ زائچے کے بموجب اس کی پیدائش کے وقت سورج برج حمل سے نکل کر برج سرطان میں داخل ہو رہا تھا۔

کندن کمار!

یہ نام تو اپنے لئے اس نے خود تجویز کیا تھا۔ ایسے ہی نہیں سوچ بچار کے بعد۔ ہندستان کے دو مشہور ترین فلمی ستاروں یعنی کندن لال سہگل اور اشوک کمار کے ناموں کا مرکب کہ شاید اس نام کی برکت ہی سے اس کی قسمت چمک اٹھے۔

کتنے سال سے ہیرو بننے کی خواہش اس کے سینے میں سلگ رہی تھی

وہ چھ یا شاید سات سال کا تھا اور پاٹھ شالا میں داخل ہی ہوا تھا کہ اس کے قصبے کرنال میں پہلی بار ایک "ٹورنگ سنیما" آیا۔ اب تو اسے فلم کا نام بھی یاد نہ تھا۔ ایڈی پولو کا کوئی "مار دھاڑ، مکہ بازی اور سنسنی خیز واقعات سے لبریز فلم" تھا۔ ہالی وڈ سے چل کر نہ جانے کہاں کہاں ہوتا ہوا شاید دس بارہ برس میں کرنال پہنچا تھا۔ "ٹاکی" ایجاد ہو چکے تھے مگر یہ فلم خاموش ہی تھا۔ اور کیونکہ سب ٹائٹل انگریزی میں لکھے ہوئے تھے اس لئے ایک چرب زبان آدمی ساتھ ساتھ سمجھاتا جاتا تھا۔ بہ آواز بلند "دیکھو۔ دیکھو۔ سفید گھوڑے پر سوار یہ ایڈی پولو چلا آ رہا ہے ... ... اب یہ اکیلا ان سب ڈاکوؤں کا مقابلہ کرے گا ... ... شاباش، بہادر۔ شاباش۔ مار ... سالے کو۔ ایک اور دے ... ... وہ مارا! ..." اور جب پردے پر ایک پھولے پھولے گالوں والی میم کا بڑا سا چہرہ نظر آیا اس وقت اس نے جوش میں آکر کہنا شروع کیا، "دیکھو دیکھو۔ کیا مزے دار لونڈیا ہے۔ پٹاخہ ہے پٹاخہ"۔ اس وقت کندن کمار (بلکہ کہنا چاہئے سورج مل)، کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ کوئی لونڈیا "پٹاخہ" اور کیسے ہو سکتی ہے۔ اور مزے دار تو کوئی کھانے کی چیز ہی ہو سکتی ہے۔ جیسے کلو حلوائی کی بنائی ہوئی گلاب جامن یا قلفی والے کے ہنڈے میں سے نکلی ہوئی ملائی کی برف، یا نواب صاحب کے باغ میں سے چرائے ہوئے کھٹ مٹھے چوسنے کے آم۔ پھر اس نے دیکھا کہ ایڈی پولو اس لڑکی کے ڈبل روٹی جیسے پھولے گالوں کو چکھ رہا ہے اور شاید اسے بھی یہ لڑکی "مزے دار" ہی لگی ہو گی کہ فوراً ہی اس نے اس کے ہونٹوں کو چوسنا شروع کر دیا ....

بالکل ایسے ہی جیسے برسات میں زرد زرد آموں کو چوستے ہیں!

یوں تو شہر کے سب بچے ہی سینما دیکھ کر پڑھائی لکھائی، کھیل کود سب بھول بیٹھے مگر سورج مل تو اس نئے تماشے پر بالکل ہی مر مٹا۔ سات دن جب تک سینما کرنال میں رہا وہ روزانہ کسی نہ کسی بہانے سے وہاں جاتا رہا۔ کیا جادو بھرا تماشہ تھا۔ روز نیا کھیل۔ کبھی گھوڑے دوڑ رہے ہیں، کبھی بندوقیں اور پستول چل رہے ہیں، کبھی صاحب اور میمیں ناچ رہی ہیں، کبھی ڈاکو چلتی ریل کی چھت پر چڑھے ہوئے ایک دوسرے سے گھونسہ بازی کر رہے ہیں۔ کبھی ایک ناٹا سا، دبلا سا، چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا مسخرہ ٹیڑھی ٹیڑھی ٹانگوں سے چل کر ہنسا رہا ہے۔ کچھ عجیب تنوع۔ عجیب حرکت، عجیب سنسنی، عجیب جادو تھا اس تماشے میں۔

"ٹورنگ سینما" اپنا تنبو اور مشین اٹھا کر کسی اور شہر روانہ ہو گیا۔ پاٹھ شالہ میں آ۔ آ۔ ب۔ با۔ پ سے پٹری گردان پھر شروع ہو گئی۔ بچوں نے پھر گلی ڈنڈے، کبڈی اور گولیوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ رام لیلا کے سوانگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مگر سورج کے ننھے دماغ پر سینما کا جادو مسلط رہا۔ "کاش میں بھی ایکٹر بن جاؤں"۔ وہ سوچتا۔ "اور پھر ایک سفید گھوڑے پر چڑھ کر ڈاکوؤں کا مقابلہ کروں، چلتی ریل سے دریا میں چھلانگ لگاؤں، صاحب لوگ میموں کی طرح ناچوں ... اور ... اور ... اگر کبھی کوئی پھولے پھولے گالوں والی لونڈیا مل جائے تو اس کو چکھ کر دیکھوں کہ وہ مزے میں کلو حلوائی کی گلاب جامن کی طرح میٹھی ہے یا کچی ناشپاتیوں کی طرح کھٹی! ... ...

"لائٹس آف"

اور بغیر اپنے خیالات کے بہاؤ کو روکے کندن نے بٹن دبا کر اپنی لائٹ کو بجھا دیا۔ اُسے اس لائٹ اور اس کام سے بھی لگاؤ تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ہمیشہ "بتی بجھاؤ۔ بتی جلاؤ" کے احکامات سننے والا لائٹ قلی ہی رہنا چاہتا تھا۔ ایک نہ ایک دن تو اسے ہیرو بننا تھا اور وہ ضرور ہیرو بن کر رہے گا۔ مگر فی الحال یہ کیا کم تھا کہ وہ ایک اسٹوڈیو میں آ جا سکتا تھا۔ بڑے بڑے مشہور فلم ستاروں کو قریب سے دیکھ سکتا تھا، چپکا بیٹھا ایکٹنگ اور فلم سازی کے سب گُر سیکھ سکتا تھا۔ اور پھر اس کام میں دماغ پر تو زور ڈالنا ہی نہیں پڑتا تھا "بتی جلاؤ"، بٹن دبا دیا۔ "بتی بجھاؤ"، بٹن دبا دیا۔ "ہارڈ کرو"۔۔۔ ایک پھرکی کو سیدھی طرف گھما دیا۔ "سوفٹ کرو"، پھرکی کو الٹی طرف گھما دیا۔ ... ... اور اس تمام عرصہ جو چاہو سوچو ... وہ دس یا گیارہ برس کا تھا اور میونسپل بورڈ سکول کے چوتھے درجے میں پڑھتا تھا جب ٹین کی چھت اور کچی دیواروں کا ایک مستقل سینما کرنال میں بن گیا اور سورج کو باقاعدہ فلم دیکھنے کا موقعہ آخر کار نصیب ہو ہی گیا۔ ہفتے میں کم سے کم ایک بار وہ سینما ضرور جاتا۔ اور فلم اچھا ہوتا یا برا اس کے جذبۂ شوق کی تسکین بہرحال ہو جاتی۔ بلکہ ہر فلم اس کے بڑھتے ہوئے دماغ پر نئے نئے محسوسات کے نقوش چھوڑ جاتا۔

کئی برس تک سینما کا جادو اس پر اثر کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس رُپہلی پردے کی چلتی پھرتی تصویروں میں ایک عجیب کشش ہے۔ مگر ابھی تک اُس میں متحرک سایوں میں تمیز کرنے کی سمجھ بوجھ نہ پیدا ہوئی تھی۔ وہ کسی خاص قسم کا

فلم، کسی خاص کمپنی کا فلم، کسی خاص سٹار کا فلم دیکھنے نہیں جاتا تھا۔ وہ صرف فلم دیکھنے جاتا تھا۔ کیسا بھی ہو، کسی کا بھی ہو۔ "جو کچھ ملے، جہاں بھی ملے، جس قدر ملے۔"

مگر جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی اور اس کا شوق تیز تر ہوتا گیا، سینما کی کشش ایک مبہم اور بے نام جذبے کی حد سے نکل کر مخصوص اور معلوم شکلیں اختیار کرتی گئی۔

گوہر کا گداز جسم۔

ماسٹر وٹھل کی پھرتی اور شہسواری اور اس کا کسرتی بدن۔

سلوچنا کی گوری رنگت، چمکیلے سیاہ بال اور بڑی بڑی آنکھیں،

بلیموریا کی باریک اور نکیلی مونچھیں۔

مادھوری کی تیزی اور طراری اور ملین کا چلبلا پن۔

چارلی غوری ڈکسٹ کی دھما چوکڑی جس کو دیکھ کر پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑ جاتے تھے۔

خوبصورت آنکھوں والی زبیدہ۔ "اف تیری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی!"

اور پھر ہندستانی فلم بول پڑے۔ اور وہ جنت نگاہ "اب" فردوس گوش" بھی بن گئی۔ نہ صرف آنکھ کے راستے بلکہ کان کے راستے بھی یہ چلتی پھرتی تصویریں دلوں میں گھر کرنے لگیں۔

اف وہ کجن کی نقرئی آواز۔

ماسٹر نثار کی سریلی تانیں۔

آغا حشر کے لکھے ہوئے پُر رعب مکالمے

اور پھر سہگل ــــ جادو بھری آواز والا سہگل۔

اور زبیدہ کا وہ ایک انوکھے انداز سے تتلا تتلا کر بولنا!

سورج نے کسی نہ کسی طرح مڈل پاس کر لیا۔ اس کا باپ جو پنساری کی دکان کرتا تھا، چاہتا تھا کہ اب بیٹا پڑھائی چھوڑ کر اس کا ہاتھ بٹائے۔ مگر سورج کا دل سینما کی رومانی رنگینیوں سے آشنا ہو چکا تھا۔ اس کو کب گوارا تھا کہ اپنی زندگی سونف، کالی مرچ، ہلدی اور نمک کی پڑیاں باندھنے میں گزار دے اور ایک بار اسکول چھوٹ گیا اور دوکان پر بیٹھنے کا معمول بن گیا تو پھر سینما دیکھنے کی مہلت بھی کب ملنے والی تھی! حالانکہ اس کا دل پڑھائی میں بھی نہیں لگتا تھا، مگر اس نے یہی بہتر سمجھا کہ باپ کو سمجھا بجھا کر دو سال اور ہائی اسکول میں گزارنے کی مہلت حاصل کرے اور اس عرصے میں کوئی ایسی ترکیب نکالے جس سے وہ بمبئی کی فلمی دنیا میں قدم رکھ سکے۔

اب اس کی عمر سترہ برس کے لگ بھگ تھی۔ خاصا کھلتا ہوا رنگ، ناک نقشہ برا نہیں، قد ساڑھے پانچ فٹ سے کچھ زیادہ ہی، لمبے بال جو بڑی محنت سے گھونگھر والے بنائے گئے تھے۔ ہر بار جب وہ آئینہ دیکھتا اس کو یقین ہو جاتا کہ ایک بار کوئی ڈائرکٹر اس کو دیکھ لے تو پھر ہر اسٹوڈیو کے دروازے اس کے لئے کھل جائیں گے۔

اس سال رام لیلا کا میلا لگا تو اس میں دلی کے ایک فوٹوگرافر نے دکان

جمائی۔ "ایک روپیہ میں آٹھ فوٹو"۔ اور مزا یہ کہ پانچ منٹ میں تیار۔ سورج سب
سے پہلے پہنچا۔ باپ سے چھپا کر ایک ٹائی "ہر مال ملے گا ساڑھے نو آنے میں" لے
لی تھی۔ وہ کالردار قمیص میں لگائی۔ اوپر وہی اسکول والا کوٹ۔ نیا دھلا اور
استری کیا ہوا۔ فوٹو میں تو صرف گردن سے ذرا نیچے تک آنے والا تھا۔ معلوم ہوگا
سوٹ پہنے ہے۔ فوٹو کھنچنے شروع ہوئے۔ سورج نے فلمی رسالوں میں ایکٹروں
کی تصویروں کا خاص مطالعہ کیا تھا۔ وہی "پوز" دینے شروع کئے۔ فرنٹ
ویو، سائڈ ویو، پروفائل۔ تھری فورتھ۔ فوٹوگرافر نے دو چار قسم کی ٹوپیاں
رکھ چھوڑی تھیں۔ ان میں سے بڑے بڑے چار خانوں کی ایک "نائٹ کیپ"
سر پر جما کر ایک فوٹو امریکن ایکٹروں کی وضع کا۔ پھر ٹوپی اور ٹائی اور کوٹ اتار
ڈالا۔ قمیص کا کالر اوپر چڑھ گیا۔ بال بکھر گئے۔ آنکھوں میں حسرت اور یاس اور
عشق کا جنون۔ یہ ہوا "ناکام عاشق"۔ پھر بال اور بکھر گئے اور آنکھیں اوپر
چڑھ گئیں۔ فوٹوگرافر نے بیر کی خالی بوتل میں کاغذ کے پھول رکھ چھوڑے تھے
لپک کر اسے اٹھا لیا۔ تو یہ ہوا "آنکھ کا نشہ"۔ اب ایک فوٹو رہ گیا۔ اس میں
کیا کیا جائے۔ فوٹوگرافر نے شاید ایکٹر بننے کے خواہشمند نوجوانوں کے فوٹو لینے
ہی میں مہارت حاصل کی تھی۔ اس نے فوراً ایک بنی بنائی داڑھی مونچھ پیش
کی۔ سورج نے عینک جیسی کمانیوں کو کان میں اٹکا کر داڑھی "پہن" لی اور بغیر
میک اپ کے اپنے چہرے پر بڑھاپے کے آثار نمودار کرنے کی کوشش
کی۔ یہ ہوا "یہودی کی لڑکی" کا "بوڑھا باپ" یا "بدنصیب قیدی"۔ تاکہ
ڈائرکٹروں اور پروڈیوسروں پر آشکار ہو جائے کہ وہ کیرکٹر ایکٹنگ کے میدان

میں بھی اپنے جوہر دکھا سکتا ہے۔

اس رات کو کندن کمار نے جنم لیا۔ جب وہ فلم کمپنیوں کے نام خط لکھنے بیٹھا تو دفعتاً اُسے خیال آیا کہ سورج مل ایک نہایت غیر رومانی اور بنیا قسم کا نام ہے۔ اس نام کے لڑکے کو کوئی ہیرو نہیں بنائے گا۔ پھر کون سا نام اختیار کیا جائے۔؟ جب سے کمار نے "پورن بھگت" میں نام پیدا کیا تھا "کمار" تو ایکٹر کے نام کا ایک لازمی جزو ہو گیا تھا۔ اشوک کمار۔ سوشیل کمار۔ انیل کمار۔ سونیل کمار۔ دلیپ کمار۔ یہ کمار وہ کمار۔ اور پھر ان میں سے کسی کا اصلی نام بھی تو کمار نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اشوک کمار کا اصلی نام گنگولی تھا اور خود کمار کا نام میر علی۔ تو پھر سورج مل بھی کیوں نہ سہگل سے اس کے نام کا پہلا حصہ مانگ کر کندن کمار بن جائے؟ ... غرض خطوط اور فوٹو فلم کمپنیوں کے نام روانہ کر دیئے گئے اور خواب میں ایک کے بعد ایک کریڈٹ ٹائیٹل نظر آتے رہے۔

بمبئی ٹاکیز پریزنٹس

کندن کمار

اِن

"سپوت"

بمبئی ٹاکیز پریزنٹس ... ...

نیو تھیٹرز پریزنٹس ... ...

پربھات فلم کمپنی پریزنٹس ... ...

منروا موویٹون پریزنٹس ... ...

رنجیت فلم کمپنی پریزنٹس ... ...

اور پھر بیک گراؤنڈ میوزک کی جھنکار کے ساتھ ایک پردے پر نام چمکتا ہوا ... ...

کندن کمار!

کندن کمار!!

کندن کمار!!!

کندن کمار!!!!

کندن کمار!!!!!

کـنـدن!

"ابے او کندن! سوتا ہے کیا؟" نمبر ستائیس آف "

ایک لمحے کے لئے لائٹ قلی، کندن فلم اسٹار، کندن کمار کے سپنوں میں کھو گیا تھا۔ اسسٹنٹ کیمرہ مین کی پکار پر وہ ہڑبڑا اٹھا۔

شاٹ ختم ہو گیا تھا۔ اور سب روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ صرف کندن کی نمبر ستائیس کی روشنی ایک پیلے دائرے میں مس شکنتلا پر پڑ رہی تھی جس نے ابھی ابھی فلم کے آخری شاٹ کے ڈائلاگ بولے تھے۔ چالیس فٹ نیچے سیٹ کی ہر چیز۔ دیواریں جو لکڑی کے ٹیکوں کے سہارے کھڑی تھیں اسٹینڈز پر لگی ہوئی لائٹس، کیمرہ، اس کے پیچھے رکھی ہوئی کرسیاں۔ کھلونا معلوم ہوتی تھیں اور ہر شخص گڑیا معلوم ہوتا تھا۔ مس شکنتلا، دیپ کمار،

ڈائرکٹر باسو جو ابھی تک طے نہ کر پایا تھا کہ شاٹ کو "او کے" کہے یا "این جی" اور برابر بڑبڑائے جا رہا تھا "ٹھیک تھا ... ٹھیک تھا ... مگر یہ پکچر کا لاسٹ شاٹ ہے۔ اپنے کو کچھ اور مانگتا ... کوئی پکٹوریل افیکٹ ... " اور پھر اس نے نہ جانے کیا دیکھا یا سوچا اور اپنی مخصوص جوشیلی آواز میں چلا اٹھا "

"آئی گیٹ اٹ۔ دس از وہاٹ آئی وانٹ!"

اور اسی وقت کندن نے اپنی لائٹ کو بجھا دیا۔ ایک لمحے کے لئے اُسے ٹمٹماتی ہوئی "ہاؤس لائٹ" میں سیٹ کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ مگر ڈائرکٹر باسو کی آواز سنائی دی۔

"اینڈ ہیٹ! وہی لائٹ تو اپنے کو مانگتا"۔

اور پھر اسسٹنٹ کیمرہ مین کی دہاڑتی ہوئی آواز۔

"نمبر ستائیس۔ آن کرو"

بتی بجھاؤ!

بتی جلاؤ!

اندھیرا اور اُجالا۔ اُجالا اور اندھیرا۔

کندن نے لائٹ جلا دی۔

اب اس نے دیکھا کہ ڈائرکٹر باسو مس شگفتا کو اس لائٹ کے دائرے میں مختلف زاویوں سے کھڑا کر کے دیکھ رہے ہیں۔ اور کہتے جا رہے ہیں "اب کچھ بنا یہ شاٹ"۔

اور پھر ڈائرکٹر اور موٹے کیمرہ مین چندو بھائی کی ایک کانا پھوسی

کانفرنس ہوئی جس میں وہ صرف "بار بار "نمبر ستائیس" کا ذکر سن رہا تھا۔ اور کندن سوچنے لگا "آج تو میری لائٹ کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔"

کیمرہ مین گجراتی اور ڈائرکٹر بنگالی اور مشترکہ زبان ہندوستانی۔ بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی اور آوازیں بتدریج بلند ہوتی گئیں۔

"ہم بولتا، چندو بھائی، ہم کو یہ ایفکٹ مانگتا۔"

"وہ ٹھیک ہے صاحب۔ پر اتنے اونچے سے صرف ایک لائٹ دیں گے تو ایک دم پھچڑ ڈارک ہو جائے گی۔ کم سے کم دو دس سپاٹ اور دو تین بے بیز دیں تو ... ..."

"نو۔ نو۔ یو ڈونٹ انڈرسٹینڈ، چندو بھائی۔ اپنے کو ایک لائٹ کا سرکل مانگتا۔ بس جب کیمرہ کرین پر اوپر لانگ شارٹ میں جائے گا اس لائٹ کے سرکل میں ہیروئن کھڑی ہو گی ... ... اوپر دیکھتی ہوئی ... لائٹ اس کی آنکھوں میں ... ... ..."

"پر باسو صاحب۔ چالیس فٹ اوپر سے لائٹ ماریں گے تو اس کا سرکل بہت بڑا بنے گا اور لائٹ اتنی ڈفیوز diffuse ہو گی کہ کچھ رجسٹر register نہیں ہو گا۔"

"ہم نہیں جانتے۔ تم کیمرہ مین ہے۔ کوئی ترکیب نکالو۔"

کندن چھ مہینے سے اس انتظار میں تھا کہ اسے اپنی کارگزاری دکھانے اور انفرادیت جتانے کا کوئی موقع ملے۔ وہ اوپر ہی سے چلایا "چندو بھائی۔ اگر لائٹ چالیس فٹ کے بجائے بیس فٹ پر آجائے تو چلے گا؟"

ایک لائٹ قلی کو دخل در معقولات کرتے دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ چندو بھائی کا جی چاہا کہ اسے جھڑک دے مگر پھر اُسے خیال آیا کہ کندن کی تجویز کچھ بری نہیں ہے۔

ڈائرکٹر باسو تو کھِل گئے "یس۔ یس۔ دیٹ از رائٹ۔ لائٹ نیچے آجائے گا تو سرکل چھوٹا ہو جائے گا اور ڈفیوز diffuse بھی نہیں ہوگا"

"پر بیس فٹ پر نیا تختہ لگانے اور لائٹ فکس کرنے میں تین چار گھنٹے لگ جائیں گے"۔ چندو بھائی نے پہلے سے معاملہ صاف کر دینا مناسب سمجھا کیونکہ ہمیشہ فلم مکمل ہونے میں جو دیر لگتی تھی اس کا ذمے دار اسی کو ٹھہرایا جاتا تھا۔

"کوئی پرواہ نہیں"۔ ڈائرکٹر باسو نے فیصلہ کن انداز میں کہا "مگر شاٹ بھی تو کیا شونڈر ہوگا"۔

"نہیں نہیں۔ یہ کیا شونڈر وونڈر لگایا ہے"۔ یہ سیٹھ جی تھے اسٹوڈیو کے مالک "پکچر ویسے ہی لیٹ ہو گئی ہے۔ اور تم لوگ ری ٹیک پے ری ٹیک کئے جاتے ہو۔ میرا پیسہ حرام کا نہیں ہے۔ اگر دوسرا شاٹ آدھ گھنٹے میں لے سکتے ہو تو لو، نہیں تو پہلے شاٹ کو اوکے کرو"۔

اسٹوڈیو کی سماج میں سیٹھ جی کا درجہ بادشاہ بلکہ ڈکٹیٹر کا تھا کندن جانتا تھا کہ اسٹوڈیو کے ان لکھے قانون کی رو سے ہر لائٹ قلی کو اسسٹنٹ کیمرہ مین کی گالیاں کھانا پڑتی ہیں، اسسٹنٹ کیمرہ مین خود کیمرہ مین کی گالیاں کھاتا ہے، کیمرہ مین ڈائرکٹر کی ڈانٹ سنتا ہے۔ پر اگر کوئی ڈائرکٹر کو بھی سخت

سمت کہنے کا اختیار رکھتا ہے تو وہ سیٹھ جی ہیں۔ ان کے سامنے کسی اور کو بولنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔ پر آج وہ ہر خطرے کو مول لینے کے لئے تیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بغیر اس کو ترقی کرنے کا کوئی موقع نہ ملیگا۔

"سیٹھ جی!" وہ چلایا "میں پانچ منٹ میں لائٹ نیچے کئے دیتا ہوں۔"

اسٹوڈیو کے کھوکھلے خول میں اتنے اوپر سے اس کی آواز خوفناک طریقے سے گونجی۔ اس کی جرأت بلکہ بے ادبی پر سب دنگ رہ گئے۔ اس کے ساتھی دوسرے قلی تو سمجھے کہ آج کندن کی خیریت نہیں۔ یہ ضرور اسٹوڈیو سے نکالا جائے گا۔ پر سب کو حیرت ہوئی جب سیٹھ جی اوپر دیکھ کر بولے۔

"کیسے کرے گا؟"

"ابھی دکھاتا ہوں" اور یہ کہہ کر کندن نے پٹڑے کے دونوں طرف مزید مضبوطی کے لئے جو فالتو رسی کے ٹکڑے بندھے ہوئے تھے انھیں نکال لیا۔ اب پٹڑا گاڈر میں اکہری رسی سے لٹکا ہوا رہ گیا۔ مگر رسی مضبوط تھی اور کندن کا وزن کچھ زیادہ نہیں تھا۔ سستے ہوٹلوں میں کھاتے کھاتے دس سیر کم ہو چکا تھا، اس نے رسی کے ٹکڑوں کو مضبوط گرہیں باندھ باندھ کر بیس فٹ لمبا کر لیا اور ایک سرا پٹڑے میں باندھ کر اور دوسرا سرا لائٹ کے کنڈے میں ڈال کر لائٹ نیچے لٹکا دی۔ سب اس کی سمجھ اور پھرتی کے قائل ہو گئے۔ خود سیٹھ جی نے "چلے گا۔ چلے گا" کہہ کر اس کی داد دی۔

"لائٹ آن"

"روشنی کا گھیرا مس شکنتلا پر پڑا۔ بالکل ٹھیک۔ نہ ایک فٹ اِدھر نہ ایک فٹ اُدھر۔ مگر جیپندو بھائی کبھی کسی لائٹ سے مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کو ایک دفعہ پورا ہارڈ گرا کے پھر پورا سو فٹ نہ گرا دے۔

"ٹھیک ہے۔ پر ذرا اور نیچے ہو جائے تو اچھا رہے گا"

اب مشکل یہ تھی کہ رسی اتنی ہی تھی۔ لائٹ کو نیچے کیا جائے تو کیسے۔ مگر آج کندن ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے رسی کو ٹپڑے میں سے کھول لیا۔ بائیں ہاتھ سے ٹپڑے کو مضبوطی سے پکڑا اور داہنے ہاتھ میں رسّی کے سرے کو تھام کر لائٹ کو دو فٹ اور نیچے لٹکا دیا۔

"ٹھیک ہے"

"ریہرسل!"

"ساؤنڈ ریڈی فور ریہرسل"

"یس مس شکنتلا"؟

"بھگوان — مجھے سندر کے راستے پر ... " اور مس شکنتلا اٹک گئیں کیونکہ جب انھوں نے اوپر بھگوان کی طرف دیکھا تو ایک من وزنی لائٹ کو عین اپنے سر پر لٹکا پایا۔

"یہ لائٹ میرے اوپر گر پڑی تو کون ذمہ دار ہوگا"

اور اب کندن کو اس کا ذمہ بھی لینا پڑا۔ "گھبرائیے مت، مس

شکنتلا۔ آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔" اور وہ دل ہی دل میں خوش تھا "آج پہلی بار اتنی مشہور ہیروئن سے بات کرنے کا موقع ملا ہے۔ کون جانتا ہے کل اس کے ساتھ دیپ کمار کے بجائے شاید میں خود ہی پارٹ کر رہا ہوں"۔

خیر مس شکنتلا نے حامی بھری۔ ریہرسل "او کے" ہوا، سیٹیاں بجیں۔ دروازے بند ہوئے اور شاٹ شروع ہوا۔

"ساؤنڈ سٹارٹ"

دو سیٹیاں

"کیمرہ! کلیپ!"

کیمرہ کرین پر چڑھا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ شکنتلا کے کلوز اپ سے کیمرہ پیچھے اور اونچا ہوتا چلا گیا۔

اور چالیس فٹ اونچے، ایک پتلے تختے پر ٹنگا ہوا، ایک ہاتھ سے سہارا لئے ہوئے اور دوسرے میں ایک وزنی لائٹ لٹکائے ہوئے کندن سوچ رہا تھا۔

"یہ شاٹ میرا ہے۔ میں نہ ہوتا تو کبھی اس طرح نہ لیا جاتا"۔ پر اس کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ بوجھ سے اس کے دائیں ہاتھ کی رگیں کھنچ رہی تھیں اور بایاں ہاتھ سن ہوا جا رہا تھا۔ اور اس کے کانوں میں مس شکنتلا کے الفاظ گونج رہے تھے۔ "یہ لائٹ میرے اوپر گر پڑی تو کون ذمہ دار ہوگا؟"

نیچے کی طرف نظر کی تو سیٹ پر ہر چیز — کیمرہ، کرسیاں، لائٹس — گھومتی نظر آئی

آہستہ آہستہ مس شکنتلا نے اپنی نظر اوپر اٹھائی۔ بھگوان کی طرف۔ کندن کی طرف۔ روشنی عین اس کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ کندن کو نہیں دیکھ سکتی تھی مگر وہ اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے حسین چہرے کو جو سفید ساڑھی کے آنچل میں نورانی معلوم ہو رہا تھا ....

اور کندن ایک لمحے کے لئے بھول گیا کہ وہ ایک ہاتھ میں وزنی لائٹ سنبھالے ہوئے ہے۔ پتلے تختے کا توازن بگڑ گیا اور رسیاں ٹوٹی نہیں مگر ایک طرف کی دفعتاً اس طرح کھنچ گئیں کہ کندن کو سخت جھٹکا لگا، اگر اس کا بایاں ہاتھ رسی سے پھسل کر تختے پر نہ لگتا اور وہاں اس کی انگلیاں مضبوطی سے نہ جم جاتیں اور اگر لائٹ والی رسی پر اس کے دائیں ہاتھ کی گرفت ذرا بھی ڈھیلی پڑ جاتی تو لائٹ اور کندن دونوں چالیس فٹ نیچے مس شکنتلا کو چکنا چور کرتے ہوئے اسٹوڈیو کے سیمنٹ کے فرش پر آ رہتے۔ موت کے خوف کی سنسناہٹ اس کے تمام بدن میں دوڑ گئی۔ پر اس وقت اپنی جان سے بھی زیادہ اُسے اپنے وعدے کی فکر تھی جو اس نے مس شکنتلا سے کیا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں رسی میں گڑ گئیں اور اس نے لائٹ کو ہلنے تک نہ دیا۔

شاٹ جاری رہا۔ اس ڈرامے سے بے خبر مس شکنتلا اپنا ڈائلاگ بولتی رہیں۔

"اے بھگوان! مجھے سندر کے راستے پر چلنے کی شکتی دے!" اور سوائے چند دوسرے لائٹ فلیوں کے جن کے منہ سے تقریباً چیخ نکل گئی

تھی اور سیٹھ جی کے جو کونے میں کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ کسی کو یہ نہ معلوم ہوا کہ اس شاٹ کی خاطر کندن نے تقریباً اپنی جان ہی دے دی۔

شاٹ ختم ہو گیا۔

"ہاؤ ایز دیٹ فور ساؤنڈ؟"

"او کے"

"او کے"

"او کے"

ڈائرکٹر باسو خوش تھے۔ مس شکنتلا کو مبارکباد دے رہے تھے چندو بھائی خوش تھے۔ اپنے اسسٹنٹ کو بتا رہے تھے کہ اس قسم کے لائٹ افکٹ میں کوئی دوسرا کیمرہ مین ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا مس شکنتلا خوش تھیں اور دیپ کمار کو بتا رہی تھیں کہ ایسے شاٹ میں وہ دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو کر ایکٹنگ کرتی ہیں "اگر مجھ پر اوپر سے وہ لائٹ گر بھی پڑتی تو مجھے پتہ نہ چلتا"۔ اور انھیں نہیں معلوم تھا کہ ان کی موت ان کے کتنے قریب سے گزر گئی تھی۔

یہ آخری شاٹ تھا۔ سب رخصت ہونے لگے۔ کندن نیچے اتر آیا۔ اور یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ سیٹھ جی اس کے انتظار میں کھڑے تھے

"اے کیا نام ہے تیرا؟"

"کندن سیٹھ جی"

"شاباش۔ تو بڑے جگرے کا آدمی ہے۔ ہم نے دیکھا تو نے مس شکنتلا

کا جان بچا لیا"

"یہ تو میرا فرض تھا سیٹھ جی ..."

"بول کیا انعام چاہیئے؟"

کب سے وہ اس لمحے، اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ میں یہ کہوں گا۔ میں یہ کہوں گا "سیٹھ جی مجھے ایکٹنگ کا چانس چاہیئے۔ میں ہیرو بننا چاہتا ہوں۔ ایک بار۔ بس ایک بار۔ موقع دیجئے" مگر اس وقت اس سے کچھ نہ کہا گیا۔ سو سیٹھ جی ہی بولے۔

"اچھا کل آفس میں ملو۔ ہم تم کو کوئی انعام بھی دے گا اور کوئی اسپیشل کام بھی دے گا"

اور جب کندن اسٹوڈیو سے باہر آیا تو سب کی نظریں اس پر تھیں اور اس کے قدم زمین پر نہیں ہوا پر پڑ رہے تھے۔

# دوسرا ریل

(جس میں آپ ہیروئن کو پہلی بار دیکھتے ہیں)

کندن سو کر اٹھا تو سروپ اور مرزا دونوں نہا دھو مانگ پٹی کر کے باہر جانے کو تیار کھڑے تھے۔ ان تینوں نے دادر مین روڈ پر رنجیت اسٹوڈیو کے قریب کی ایک چال میں ایک مشترکہ کھولی کرائے پر لے رکھی تھی۔ تینوں اپنے اپنے گھر سے بھاگ کر بمبئی آئے تھے۔ تینوں فلم اسٹار بننے کی حسرت دل میں رکھتے تھے۔

مرزا بولا۔

"کیوں بے کندن، چل آج تجھے بھی کام دلا دیں، مغل اعظم، کا بڑا گرینڈ سیٹ لگا ہوا ہے بمبئی ٹاکیز میں۔ وہاں تین چار سو آدمیوں کی ضرورت ہے۔

ہے دربار سین کے واسطے"۔ مرزا جو ایف اے فیل تھا اور شمالی پنجاب کا رہنے والا تھا اور جس کا قد چھ فٹ دو انچ تھا اور جو ایک وقت میں تیس پچیس چپاتیاں کھا سکتا تھا اور جس پہ اکسٹرا لڑکیاں جان دیتی تھیں ڈیڑھ برس سے فلمی قلعہ کو سر کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر سوائے موہن کی ایک اسٹنٹ فلم کے جس میں اس نے چارخانے کی قمیض اور برجیس پہن کر ایک ولایتی قسم کے گنڈے کا پارٹ کیا تھا اس کو کوئی کامیابی نہ ہوئی تھی۔ اس لئے وہ اکسٹرا کی حیثیت سے آٹھ دس دن بھیڑ کے کسی سین میں کھڑے ہونے کی جگہ مل جائے اسی کو غنیمت سمجھتا تھا۔ آج رنجیت میں ڈاکو بنا ہوا ہے تو کل راج کمل میں سادھو۔ پرسوں منروا میں مغل درباری تو اس سے اگلے دن پرکاش میں بکرماجیت کا سینک۔ وہ بمبئی میں اکسٹرا کا کام کرنے نہیں اسٹار بننے آیا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اس کو بھوک بہت لگتی تھی اور اتنا بڑا جسم ایندھن بھی بہت مانگتا تھا اس لئے جب چھ ماہ تک ہر اسٹوڈیو کا چکر لگانے کے بعد اس کو کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے بھی شرم کو بالائے طاق رکھ کر دادا گنجا اکسٹرا سپلائر کے ہاں اپنا نام لکھوا دیا۔

ہاں تو جب مرزا نے کہا۔

"کیوں بے کندن، چل آج تجھے بھی کام دلوا دیں"، تو مسرو [illegible] بولا

"چھوڑو یار۔ یہ لاٹھ صاحب تو جب تک ہیرو کا پارٹ نہیں ملے گا کیمرے کے سامنے نہیں آئیں گے"

"یہ میں نے کبھی نہیں کہا" کندن نے پلنگ سے اٹھتے ہوئے

جواب دیا۔ "مگر یہ ضرور ہے کہ اکسٹرا کا گونگا کام نہیں کرونگا۔ ویسے ایک لائن بھی بولنے کے لئے مل جائے تو میں تیار ہوں"

"بڑے نخرے کر رہیں تمھارے۔ مگر یہ لائٹ قلی کا کام کرتے شرم نہیں آتی تمھیں"۔

یہ سروپ کا مستقل تکیہ کلام تھا۔ اپنے دوست اور ساتھی کو یہ "نیچ" کام کرتے دیکھ کر اُسے واقعی شرم آتی تھی۔ اور اس مسئلے پر روز اس کی اور کندن کی بحث ہوتی تھی۔ سروپ کانپور میں بی اے میں پڑھتا تھا جب وہ اپنی سوتیلی ماں کے ظلم سے چھٹکارا پانے کے لئے بمبئی چلا آیا تھا۔ رنگ گورا اور صورت شکل اچھی تھی۔ گانا بھی تھوڑا بہت جانتا تھا۔ یار لوگوں نے صلاح دی کہ فلموں میں قسمت آزمائی کرو۔ دس مہینے سے کر رہا تھا۔ قد کسی قدر چھوٹا تھا۔ پھر بھی وہ کرن دیوان سے دو انچ لانبا ہی تھا اور ایسے موتی لال ہی کون سا چھوٹا ہے! مگر پروڈیوسروں ڈائرکٹروں کو اُسے نہ لینے کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔ ایک جگہ سنا کسی "نئے چہرے" کو ہیرو کے لئے لینا چاہتے ہیں وہاں کوشش کی۔ کامیابی کی امید معلوم ہوتی تھی کہ پروڈیوسر صاحب کو خیال آیا کہ اس کا قد چھوٹا ہے۔ وینا کے ساتھ جوڑی نہیں ملے گی ...

سروپ واپس آیا اور اگلے دن مرزا کو بھیجا کہ شاید اس کی طویل قامت پروڈیوسر صاحب کو پسند آجائے۔ مگر مرزا کو دیکھ کر وہ بولے۔

"ہم تو سنسنہ پربھا یا نلینی جیونت کو ہیروئن بنانے کی سوچ رہے ہیں۔ تم تو بہت لمبے ہو۔ جوڑی نہیں ملے گی"۔ (یہ اور بات ہے کہ یہی

پروڈیوسر صاحب اپنی پچھلی فلم میں پرتھوی راج اور ثریا کی جوڑی پیش کر چکے تھے۔) یہ سن کر مسٹر دیپ، بے چارہ بھاگا بھاگا ہوا گیا کہ آپ اگر وینا کے بجائے سینہہ پربھا یا نلینی جیونت کو لے رہے ہیں تو مجھے ہیرو کا پارٹ دید یجئے۔ پروڈیوسر صاحب بولے وہ افواہ غلط تھی۔ وہ واقعی وینا ہی کو لے رہے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے سالے کو لے لیا ہے اور ساتھ میں ہیروئن شاشا رن کو بنایا ہے۔

سو اس پر مرزا نے (جو فقرے بازی کا ماہر تھا) ایک لطیفہ گھڑا جو ہر اسٹوڈیو میں دہرایا جا رہا تھا۔

پروڈیوسر ایک بڑے اور اہم فلم کی مہورت سے پہلے تمام مشہور ایکٹروں کو انٹرویو کے لئے بلاتا ہے تاکہ ان میں سے ایک کو ہیرو چنا جائے۔

سب سے پہلے اشوک کمار آتا ہے۔ مگر اس کو اس بنا پر نامنظور کر دیا جاتا ہے کہ وہ موٹا ہوتا جا رہا ہے۔

پھر موتی لال آتا ہے۔ اور اس کو گنجا ہونے کی بنا پر نامنظور کر دیا جاتا ہے۔

پھر کرن دیوان آتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نازک اندام ہے۔

پھر شیخ ممتاز آتا ہے اور اس کو ضرورت سے زیادہ پہلوان ہونے پر "ان فٹ" کر دیا جاتا ہے۔

پھر سریندر آتا ہے مگر پروڈیوسر صاحب کا خیال ہے کہ وہ بے سرا

گاتا ہے۔

پھر دیو آنند ——— مگر وہ بہت دبلا ہے

پھر جینت ——— مگر وہ بہت موٹا ہے

پھر واسطی ——— مگر وہ مسخرا معلوم ہوتا ہے اس لئے وہ سنجیدہ کردار نہیں کر سکتا۔

پھر بھارت بھوشن ——— مگر وہ سادھو معلوم ہوتا ہے اس لئے مزاحیہ کام نہیں کر سکتا۔

اخیر میں پروڈیوسر کا سکریٹری پوچھتا ہے "سیٹھ جی۔ آپ نے تو ہر ہیرو کو نا پاس کر دیا۔ آخر پھر لیں گے کسے ؟"

"وہ تو میں پہلے ہی طے کر چکا ہوں" سیٹھ جی بولے "اپنی بیوی کے بھائی کے داماد کے سالے کو لونگا"

"آؤ، دادا، آؤ" ـ مرزا نے ایک نو وارد کا استقبال کرتے ہوئے کہا "بس ہم بھی چلنے کے لئے تیار ہی ہیں"

"کیوں، دادا، کچھ سوڈا لیمن ؟" مسر وپ کے لہجے میں کچھ خوشامد کا پہلو تھا۔

"نہیں۔ سوڈا وو ڈا کچھ نہیں چاہئے ... ٹائم ہو گیا ہے۔ اب چلنا چاہئے۔ نو بجے جو ملاڈ پہنچنا ہے"

دادا گنی، جس کو فلمی دنیا کا ہر آدمی "دادا" کے نام سے پکارتا تھا۔ ایک اکسٹرا سپلائر تھا یعنی کمیشن پر فلم کمپنیوں کے لئے اکسٹرا مہیا کرتا تھا

ہراکسٹرا کو جو کچھ اسٹوڈیو سے ملتا اس میں سے آدھا دادا کی جیب میں جاتا۔ سینکڑوں نوجوان اور فلمی شہرت کے شوقین لڑکے اور لڑکیوں کا وہ "دادا نہیں بلکہ "ان داتا" تھا۔ جن سے وہ خوش رہتا تھا ان کو مہینے میں دو سو تین سو روپے تک کی آمدنی ہو جاتی تھی اور جن سے ناراض ہوتا تھا ان کو دوسرے اکسٹرا سپلائر بھی کام دلواتے گھبراتے تھے کہ کہیں دادا کو معلوم ہو جائے اور اس کا غصہ ان پر اترے۔ مرزا اور سروپ نے مدت تک دادا کے وسیلے کے بغیر کام ملنے کی کوشش کی تھی مگر ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنے کے بعد انھوں نے بھی اس کی خوشامد شروع کر دی تھی۔ یہ دونوں پڑھے لکھے، خوش پوشش اور اچھے گھرانوں کے لڑکے تھے۔ ایسے اکسٹرا مہیا کرنے سے اسٹوڈیوز میں دادا کی ساکھ بڑھتی تھی اس لئے وہ بھی ان پر خاص عنایت رکھتا تھا اور دور جانا ہو تو اکثر اپنی کھٹارا قسم کی موٹر میں ساتھ ہی لے جاتا تھا۔

پر نہ جانے کیوں کندن کو دادا کی شکل سے وحشت ہوتی تھی۔ اور تو اس کی شکل تھی ہی خوفناک۔ گہرا سانولا رنگ۔ جھکڑ پچپن سالہ عیاشی کی زندگی کے گہرے نقوش۔ اس پر داڑھی ہمیشہ تین چار دن کی بڑھی ہوئی۔ سر پر گنج اور ایک داد کی پپڑی جمی ہوئی جس میں سے کبھی کبھی پیلا پیلا پانی بھی بہتا رہتا تھا۔ بائیں گال سے لے کر پیشانی تک ایک پرانے زخم کا نشان۔ کہتے ہیں فارس روڈ کی کسی طوائف کے کوٹھے پر دادا کا کسی دوسرے موالی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ دونوں طرف سے چاقو چلے۔ دادا کو گہرا زخم آیا دس دن بعد ہسپتال سے گھر آ گیا۔ مگر اس کے رقیب کی لاش راتوں رات

کوٹھے سے سیدھی شمشان لے جائی گئی۔ دادا گنجا اس زخم کے نشان کو بڑے فخر سے دکھاتا تھا۔ وہ اکثر کہتا: "اسے دیکھ کر سب سمجھ جاتے ہیں کہ دادا گنجا کے مقابلے میں آنا کتنا خطرناک ہے" اس کے علاوہ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ نشے کے لال لال ڈورے ہوتے تھے اور منہ سے ٹھرّا اور تاڑی کی بو آتی تھی۔

باوجود اس حلیے کے دادا گنجا اپنے آپ کو بڑا رنگیلا سمجھتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ہر رات ایک نئی عورت اس کے پہلو میں ہوتی ہے۔ سینکڑوں اکسٹرا لڑکیوں سے وہ اپنی حمایت کی قیمت وصول کر چکا تھا اس کی ہوس کی پیاس بجھائے بغیر کسی اکسٹرا لڑکی کو کام ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ایک لڑکی نے انکار کر دیا تھا تو دادا نے رات کے اندھیرے میں اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا تھا اور وہ بےچاری عمر بھر کے لئے منہ دکھانے کے قابل نہ رہی تھی۔

ان سب قصوں کو سن کر کندن کو دادا کی شکل سے گھن آنے لگی تھی۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ بغیر ایسے خوفناک آدمی کو دشمن بنائے اس سے الگ رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ دور سڑک پر سے آتا دیکھتا تو راستہ کاٹ جاتا۔ مگر دادا اس پر خاص نظرِ عنایت رکھتا تھا۔ اسے شکایت تھی کہ کندن کبھی اس کے رجسٹر پر اپنا نام کیوں نہیں لکھوا لیتا۔ اور جب کبھی وہ ملتا وہ اس بات کی یاد دہانی ضرور کرتا۔

"دیکھو کندن بابو" آج بھی اس نے آتے ہی پرانا قصہ چھیڑ دیا۔

"تم تو بڑے آدمی ہو۔ اکسٹرا کا کام کیوں کرنے لگے۔ پر یاد رکھو۔ میں نے درجنوں کو ہیرو ہیروئن بنا دیا ہے درجنوں کو۔ اگر سال بھر میں تمھیں لیڈنگ رول نہ دلوا دوں تو میرا نام بھی دادا گنجی نہیں۔" اور پھر اپنا منہ اتنے قریب لے جاکر کہ کندن کو تاڑی کے بھبکے آنے لگے "لونڈیاں جو ملیں گی وہ الگ۔ تمھارے جیسے لونڈے کے پیچھے تو کتیوں کی طرح بھاگیں گی۔ کیوں کیا کہتے ہو؟"

کندن نے بات ٹالنے کی غرض سے گفتگو کو مزاحیہ رخ میں پھیرنے کی کوشش کی "جاؤ بھی دادا۔ بس دیکھ رکھا ہے تمھاری اکسٹرا لڑکیوں کو۔ نہ جانے کہاں کا کوڑا کرکٹ اٹھا لاتے ہو۔ ایک کی بھی تو ڈھنگ کی صورت شکل نہیں ہے۔"

اس قسم کے مذاق سے دادا بڑا خوش ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ ہر شخص سے اسی سطح پر بات چیت کرنے کا عادی تھا۔ فلم انڈسٹری میں اُسے اگر چڑ تھی تو ان لوگوں سے جو پارسا بنتے تھے یا شریف خاندانوں کی روایات کا دم بھرتے تھے۔ پڑھے لکھے ایکٹروں اور اچھے خاندان کی ایکٹرسوں کا وہ ہمیشہ مذاق اڑایا کرتا۔ یا ان کو بدنام کرتا پھرتا۔ اس لئے کہ وہ اس کو منہ نہ لگاتے تھے اور ان کے سامنے اسے اپنی کمتری اور رذالت کا شدید احساس ہونے لگتا تھا۔ اس لئے اسے جب کبھی بھی موقعہ ملتا وہ پڑھے لکھے اکسٹراؤں کو مفت شراب پلا پلا کر اور آوارہ اکسٹرا لڑکیوں سے میل ملاقات کرا کے ان کو اپنی ٹولی میں شامل کرنے کی کوشش کرتا۔ سروپ اور مرزا ابھی تک اس کے ساتھ ہم پیالہ ہم نوالہ تو نہیں ہوئے تھے مگر اس کی خوشامد ضرور شروع

کردی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ بہت جلد مکمل طور سے "راہ راست" پر آجائیں گے۔ اگر کوئی اب تک اس کے جال میں نہیں پھنسا تھا تو وہ کندن تھا۔ اس لئے دادا اس تاک میں تھا کہ اس سر پھرے لونڈے کو رام کرنے کے لئے کون سی چال چلے۔ جیسے ہی کندن نے اکسٹرا لڑکیوں کی بدصورتی کا طعنہ دیا وہ خوشی سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"لونڈے ہو کندن بابو۔ لونڈے۔ تم کیا جانو کام کی لونڈیا کیسی ہوتی ہے۔ عورت کی شکل سے کیا لینا۔ رات کے اندھیرے میں کالی گوری سب ایک جیسی دکھتی ہیں۔ اصل چیز تو کچھ اور ہی ہے، مسٹر"۔ یہ کہہ کر اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ایک مکروہ نشان بنایا جس کو دیکھ کر کندن کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ دادا اس کے مذاق کو کہاں سے کہاں لے جائے گا۔

"اچھا خیر" دادا نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "آؤ تمہیں ایک تحفہ مال دکھاتا ہوں۔ تم بھی قائل نہ ہو جاؤ تو دادا گنجی نام نہیں۔ آؤ جی مرزا اور سروپ۔ تم بھی کیا کہو گے کہ دادا کی پہنچ کہاں تک ہے"

یہ کہہ کر وہ ان سب کو سڑک کی طرف والی کھڑکی تک لے گیا اور باہر اشارہ کیا جہاں اس کی موٹر کے پاس ایک لڑکی کھڑی تھی۔ کندن سمجھا تھا دادا گنجا کی مستقل کافی گھدری بھدی لڑکیوں میں سے کوئی ہوگی۔ سیاہ منہ پر پاؤڈر کی تہہ جمائے۔ نیلے ہونٹوں پر لال لپ اسٹک ملے۔ کانوں میں پیتل کے لمبے لمبے جھولتے ہوئے بندے، اور تنگ بلاؤس میں سے

اُبلتا ہوا سینہ۔ مگر یہ تو کوئی اور ہی قسم کی لڑکی تھی۔ اول تو وہ بہت ہی کم عمر معلوم ہوتی تھی۔ شاید سترہ سال سے زیادہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس کے گیہواں چہرے پر میک اپ کا نام نہیں تھا۔ ملگجی سی سفید ساڑھی جس کا پلو سر پر تھا۔ موٹر کا سہارا لئے نیچی نظریں کئے کھڑی تھی۔ کسی طرح سے فلمی اکسٹرا نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پھر کندن کو خیال ہوا شاید یہ معصومیت بھی ایک فریب ہو۔ ورنہ کسی شریف لڑکی کا دادا گنجا سے کیا تعلق؟

"کیوں کیا کہتے ہو؟ ہے مال بڑھیا؟"

"لونڈیا ہے زوردار" مرزا نے تجربہ کار "لڑکی باز" کی حیثیت سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"شکل صورت سے کافی سیدھی معلوم ہوتی ہے" مروپ نے کہا "گھر سے بھاگ کر تو نہیں آئی ہے۔ کبھی اس کے گھر والوں کے ساتھ مقدمہ بازی میں نہ پھنس جاؤ، دادا"۔

دادا نے جواب میں ایک خوفناک قہقہہ لگایا "دادا کچی گولیاں نہیں کھیلا مسٹر۔ اور اس لڑکی کا تو باپ خود میرے سپرد کر گیا ہے۔ نہ جانے کہاں سے نام سن کر پوچھتا پوچھتا آج ہی صبح پہونچ گیا میرے گھر پر۔ کہنے لگا: جی میری لڑکی کو فلم کمپنی میں کام کرنے کا بڑا شوق ہے اسے کہیں نوکر کروا دو۔ میں نے کہا دیکھو کوشش کرونگا۔ ویسے تمہاری لڑکی کی شکل صورت بھی معمولی ہی ہے۔ خیر اکسٹرا میں چل جائے گی۔ آج بومبے ٹاکیز لئے جاتا ہوں ساتھ۔ قسمت اچھی ہوگی تو کام مل جائے گا۔ اس پر

وہ بڈھا کہتا ہے تو میں اسے چھوڑے جاتا ہوں۔ ہاں ایک پانچ روپے پیشگی مل جائیں تو بڑی مہربانی ہو۔ سو تین روپے دے کر اُسے رخصت کیا تو جلتے جاتے کہتا ہے دادا۔ ذرا میری لڑکی کا خیال رکھنا۔ میں نے کہا فکر نہ کرو ایسا خیال رکھونگا کہ یاد ہی تو کرو گے "

مرزا ذرا زیادہ بے تکلف تھا۔ بولا "کیوں دادا تو پھر کچھ ریہرسل وغیرہ ہوا ابھی ... ؟"

دادا کے جواب میں اتنی گرمجوشی نہ تھی "ہاں ... ہوا ... مگر ابھی ذرا بدکتی ہے۔ خیر۔ دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔ میں نے اس کے باپ سے کہہ دیا ہے کہ رات کو دیر ہو جایا کرے گی تو میں خود پہنچا دیا کرونگا"

"بڑے استاد ہو تم بھی، دادا۔ کچا دیکھو نہ پکا مال ہڑپ کر جاتے ہو" مرزا نے کہا اور ان الفاظ میں اپنی "مردانگی" کی تعریف سن کر دادا کھل گیا۔ بڑے انکسار سے بولا "ہاں بھیا، کچھ دال دلیا تو ہونا ہی چاہیے نہیں تو ہم بے چارے تو بھوکے ہی مر جائیں" اور پھر کھڑکی کی طرف دیکھ کر "کیوں، کندن بابو، کیا سوچ رہے ہو؟ ... بولو کیا رائے ہے؟"

کندن کی نظریں ابھی تک کھڑکی کے باہر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا "یہ لڑکی کسی شریف گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔ نہ جانے کیوں اس کا باپ اسے دادا گنجا جیسے انسانی بھیڑیئے کے سپرد کر گیا ہے۔ اب اس کی خیریت نہیں۔ یہ اسے خراب کئے بغیر چین نہ لے گا۔ اگر مجھ میں اتنی ہمت ہو، اگر میں فلمی ہیرو کی طرح دل گردے والا ہوں، تو اسی وقت نیچے جا کر اس

لڑکی سے صاف کہہ دوں "جا اپنے گھر جا۔ کیوں غلاظت اور آوارگی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبنے آئی ہے۔ دادا گنجا سے خبردار رہ۔ یہ سینکڑوں کی عصمت دری کر چکا ہے۔ تجھے خراب کرنے میں یہ دقیقہ اٹھا نہ رکھے گا۔ پھر بھی اگر وہ نہ مانے تو میں اسے زبردستی اس کے گھر لے جاؤں گا۔ اس کے ماں باپ سے مل کر ان سے کہوں گا۔ اپنی لڑکی کو تباہی سے بچائیں"۔ وہ بہت کچھ سوچ رہا تھا مگر جب دادا گنجا نے اس سے سوال کیا تو اس نے کھڑکی کی طرف سے منہ پھیرتے ہوئے جواب دیا "ہاں —— بری نہیں ہے"۔

"اچھا اب چلنا چاہیے۔ بہت دیر ہو گئی"، دادا گنجا نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی سونے کی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس گھڑی پر اسے بڑا ناز تھا۔ ایک بار اس نے نیپین سی روڈ پر ایک راجہ کے محل میں رات بھر ننگا ناچنے کے لئے دس ایکسٹرا لڑکیوں کا انتظام کیا تھا۔ لڑکیوں کو سو روپے فی کس معاوضہ ملا تھا اور اسے پانچسو روپے اور یہ سونے کی گھڑی انعام میں۔

دادا گنجا، سروپ اور مرزا کھٹ کھٹ کرتے زینہ اترتے ہوئے نیچے چلے گئے اور کندن پھر کھڑکی کے پاس آن کھڑا ہوا۔ وہ لڑکی ابھی تک زمین پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ مگر جب دادا گنجا موٹر کے قریب پہنچا تو لڑکی نے نظر اٹھا کر خاموشی سے اس کی طرف دیکھا، صرف ایک لمحے کے لئے دو بڑی بڑی آنکھیں بے پردہ ہوئیں اور پھر لانبی پلکوں میں چھپ گئیں۔ پر نہ جانے کیوں کندن کو ان آنکھوں میں، سر اور گردن کے خم میں

اس خاموشی میں، ایک عجیب اور عمیق مایوسی نظر آئی، جیسے ایک بکری لاچاری سے قصائی کی چھری کی طرف دیکھتی ہے اور کچھ نہیں کرسکتی۔

دادا گنجی کی موٹر روانہ ہوگئی۔ چند ایکسٹرا لڑکیاں، سینوں کو نمایاں کئے ہوئے۔ ٹوٹے چپل پہنے، کھوکھلی سی ہنسی ہنستی ہوئی رنجیت اسٹوڈیو سے نکلیں اور شری ساؤنڈ اسٹوڈیو کی طرف چلی گئیں۔ ایک پروڈیوسر کی شاندار کار زن سے گزر گئی۔ ایک لنگڑا کتا چیاؤں چیاؤں کرتا ہوا بھاگا ایک مکالمہ نویس، "منشی جی"، موٹے شیشوں کی عینک لگائے۔ کاغذوں کا پلندہ دبائے ایرانی ہوٹل میں چائے پی کر باہر نکلے اور پھر کچھ سوچ کر امر اسٹوڈیو کی طرف چل دیئے۔ ایک مشہور ہیروئن کی کھلی ہوئی سبز موٹر سینٹ کی خوشبو بکھیرتی گزر گئی۔ دادر مین روڈ پر جس کو ہندستان کا ہالی وڈ کہا جاتا ہے فلمی کارواں گزرتا رہا۔ مگر کندن کو اپنے کمرے میں دادا گنجا کی بو آتی رہی ـــ جس میں تاڑی، ٹھرا، پسینہ، پائیریا، دادر کا پیلا پانی، عیاشی، گناہ اور نہ جانے کتنی جنسی بیماریاں سب کا ست تھا۔

# تیسرا ریل

(جس میں ہیرو کو امید کے کئی جگمگاتے ہوئے چراغ
نظر آتے ہیں)

ابھی دس نہیں بجے تھے کہ کندن سیٹھ صاحب کے دفتر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ عام طور سے سیٹھ گیارہ بارہ سے پہلے کبھی نہیں آتا مگر کون جانتا ہے آج سویرے ہی آجائے۔ آخر کمپنی کا مالک ٹھیرا۔ جب چاہے آئے جب چاہے جائے۔ اور آج کندن اس بات پر تلا ہوا تھا کہ جب بھی آئے سب سے پہلے سیٹھ کی نظر اسی پر پڑے۔

اسٹوڈیو کے بیرونی احاطے میں حسب معمول چہل پہل تھی، ڈائرکٹر ہنڈا کی شوٹنگ کا "بورڈ" ۹ بجے کا لگا تھا۔ مگر ان کی ہیروئن مس نازنین ابھی نہیں آئی تھیں اس لئے کام رکا ہوا تھا۔ املی کے پیڑ کے نیچے دو اسٹنٹ

ڈائرکٹر اور ایک اسسٹنٹ کیمرہ مین کھڑے چند اکسٹرا لڑکیوں سے مذاق کر رہے تھے۔ دو کیمرہ قلی بھاری بھاری لائٹوں کو اسٹوڈیو نمبر ایک سے اٹھا کر اسٹوڈیو نمبر دو میں لے جا رہے تھے۔ چکنے اور سیاہ اور گٹھے ہوئے بدن کی گھاٹنیں لکڑی کے بھاری بھاری تختے اٹھائے "آرٹ ڈپارٹمنٹ" میں لے جا رہی تھیں۔ اور ایک سوکھے ہوئے جسم اور دھنسی ہوئی آنکھوں والے "منشی جی" موٹے موٹے شیشوں والی عینک میں سے ان مزدور عورتوں کی سڈول ٹانگوں اور ان کے کولھوں کے ابھار کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔

ساڑھے دس بجے ہی تھے کہ مس نازنین کی شاندار سیلی پیکارڈ اسٹوڈیو کے احاطے میں داخل ہوئی۔ ایک اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے لپک کر موٹر کا دروازہ کھولا۔ دوسرے نے مس نازنین کا میک اپ بکس سنبھالا اور خود ڈائرکٹر ہنڈا جب اپنی ہیروئن کا خیر مقدم کرنے آگے بڑھے تو ان کو مس نازنین کی والدہ نے اپنا نہایت بھاری پاندان تھما دیا۔ ہمیشہ کے معمول کی طرح سب سے پہلے موٹر سے مس نازنین کی نانی یعنی چُنیا بائی اُتریں، ان کے بعد مس نازنین خود اور عقب میں ان کی والدہ منی جان۔ اس طرح یہ جلوس اسٹوڈیو کی طرف چلا لیکن موڑ پر غائب ہونے سے پہلے کندن نے سنا کہ چنیا بائی اپنے پوپلے، بن دانتوں کے منہ سے ڈائرکٹر ہنڈا کو نہایت "روح افزا" قسم کی گالیاں سنا رہی ہیں کیونکہ "موڈی کاٹے" پبلسٹی منیجر نے کسی اشتہار میں مس نازنین کا نام

ہیرو یعنی مکمل راج کے بعد لکھ دیا تھا!

تھوڑی دیر کے لئے اسٹوڈیو کے بیرونی احاطے میں سناٹا چھایا رہا۔ مس نازنین کا ڈرائیور مونچھوں پرتاؤ دیتا ہوا موٹر سے اترا اور ہوٹل میں چائے پینے چلا گیا۔ سیٹھ کے دفتر کے سامنے برآمدے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور دیر تک بجتی رہی۔ کندن کا ارادہ ہوا کہ پوچھے کس کا فون ہے مگر وہ جھجک کر رہ گیا کہ شاید سیٹھ جی کے لئے ہو اور اس جرأت پر اس کو ڈانٹ پڑے۔ آخر کار اندر کے دفتر سے ایک کلرک نکلا اور فون اٹھایا

"ہیلو ... گریٹ آرٹ پکچرز ... کون چاہئے؟ ... مس نازنین؟ ... وہ شوٹنگ میں ہے۔ ہم بلا نہیں سکتے ... تمہارا نام؟ ... نام نہیں بتا سکتے؟ ... نمبر ہو تو ہم لکھ کر بھیج دے گا ... نہ نام بتاتا ہے نہ نمبر تو ہم کیا کرے گا۔ جاؤ بھاڑ میں"۔ یہ کہا اور فون کو دھڑ سے بند کر کے اندر چلا گیا۔ اور کندن سوچتا رہا یہ کس نے مس نازنین کو فون کیا تھا۔ شاید اس کا کوئی عاشق ہو اور اسی لئے نام بتانے سے انکار کر رہا ہو۔ کتنا خوش نصیب ہوگا وہ جس سے نازنین جیسی حسین لڑکی محبت کرتی ہے! ویسے تو کندن کا نوجوان اور ناتجربہ کار دل ہر ایک اسٹار کو دیکھ کر پھسل پڑتا تھا مگر نازنین کی وہ مدت سے پرستش کرتا تھا۔ گو یہ لڑکی طوائفوں کے خاندان سے تھی مگر اسے اسکول میں تعلیم دلائی گئی تھی اور اس کے بات چیت کرنے کا ڈھنگ بازاری بالکل نہ تھا۔ اسٹوڈیو میں ہر ایک سے وہ خوش خلقی سے پیش آتی تھی۔ (یہ اور بات ہے

کہ ماں اور نانی کی پہرے داری میں کسی سے زیادہ بات کرنے کا موقعہ نہیں دیا جاتا تھا کہ کہیں کسی ایسے ویسے ٹٹ پونجئے نوجوان سے محبت اور شادی ہو جائے اور ان دونوں خرانٹوں کے ہاتھ سے سونے کے انڈے دینے والی مرغی نکل جائے) اور پھر اس کے جھپکتے پپوٹوں اور آنکھوں میں ایک عجیب دلکش قسم کی ہلکی سی افسردگی تھی جس سے اس کے حسن میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا

کندن بنچ پر بیٹھا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے سامنے سے نازنین کو آتے دیکھا۔ اب اس نے اسٹوڈیو کی پوشاک پہن لی تھی۔ گھگھرے چولی میں وہ کتنی خوبصورت نظر آتی تھی۔ رعب حسن کے مارے کندن نے نظر ہٹا لی۔ مگر وہ سیدھی اسی کی طرف آئی۔

"اے۔ چھوکرا ..." نازنین کی نقرئی آواز اس سے مخاطب ہوئی "میرا فون تو نہیں آیا تھا؟"

"جی۔ جی۔ جی۔" کندن اپنی خوش قسمتی سے دوچار ہو کر ایسا گڑبڑایا کہ ہکلانے لگا "آیا۔ تو۔ تھا ..."

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"جی۔ جی۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا مگر وہ دفتر والوں نے منع کر دیا کہ نہیں بلا سکتے"

"گدھے کہیں کے"۔ اور کندن نے دیکھا کہ وہ غصے سے

اپنا نچلا یاقوتی ہونٹ موتیوں جیسے دانتوں سے دبا رہی ہے۔ پھر وہ ادھر ادھر دیکھ کر دھیرے سے بولی "اچھا دیکھو اب فون آئے تو تم خود اٹھا لینا اور میرے لئے ہو تو مجھے اسٹوڈیو میں اشارہ کر دینا۔ چلانا مت سب کے سامنے سمجھے نا"

ابھی وہ یہ بات کر ہی رہی تھی کہ ایک بوڑھے گلے کے کھانسنے کی آواز آئی۔ یہ نازنین کی نانی تھی جو جھومتی جھامتی چلی آ رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں کمزور تھیں اور اُسے سوائے قریب کی چیزوں کے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ نازنین نے کندن کی طرف التجا بھری نظروں سے دیکھا اور غڑاپ سے سیٹھ جی کے کمرے میں۔ اس کمرے کا ایک دروازہ دوسری طرف کھلتا تھا۔ عین اسٹوڈیو کے سامنے۔

پوپلی بڑھیا نے کندن کو اپنی دقیانوسی عینک کے شیشوں میں سے گھور کر دیکھا۔

"کیوں رے نازنین تو ادھر نہیں آئی؟"

"نہیں، بائی جی۔ وہ تو نہیں آئیں"

"نا جانے کہاں مر گئی" بڑبڑاتی ہوئی بڑھیا واپس چلی گئی اور کندن نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ بھی کتنا خوش قسمت تھا کہ مس نازنین نے اُسے اپنا ہمراز بنایا تھا۔ جان جائے پر اس بھید کو وہ کسی پر کبھی ظاہر نہ کرے گا!

ابھی وہ اس انتظار میں تھا کہ شاید نازنین کے لئے پھر فون آئے

کہ ایک ٹیکسی آئی اور اس میں سے عجیب ہیئت کذائی کا ایک نوجوان ہاتھ میں چمڑے کا تھیلا لئے اترا۔ گہرے رنگ کی پتلون کھلے گلے کی قمیص۔ ننگے سر۔ موٹے موٹے گول شیشوں کی عینک۔ سر کے بال خشک بے ترتیب اور کانٹوں کی طرح کھڑے ہوئے۔ ٹیکسی والے کو ایک روپیہ دیا اور سات آنے واپس لے کر اطمینان سے جیب میں رکھے۔ ظاہر ہے کہ ٹیکسی کہیں قریب ہی سے لی تھی کہ میل بھر سے کم کا ہی کرایہ دینا پڑا ٹیکسی واپس چلی گئی اور نووارد کندن کی طرف آیا۔

"کیوں بھئی سیٹھ صاحب ہیں اندر؟"

بمبئی کے کرخت ماحول میں اتنی شستہ زبان سن کر کندن متعجب ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نووارد شمالی ہندستان کا رہنے والا ہے "جی میں خود انتظار کر رہا ہوں۔ ابھی تو نہیں آئے۔ مگر آنے والے ہی ہیں۔ بیٹھئے"

نووارد کندن کے برابر بیٹھ گیا اور بولا "تب تو خواہ مخواہ ہی ٹیکسی پر پیسے برباد گئے"

زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں تھی۔ کندن خوب جانتا تھا کہ اسٹوڈیو میں نوکری تلاش کرنے والے دور سے ریل یا ٹرام یا بس سے، یا پیدل آ کر دادر اسٹیشن یا خداداد سرکل سے ٹیکسی لے لیا کرتے ہیں تاکہ اسٹوڈیو والوں پر ذرا رعب پڑ جائے۔

"تو آپ بھی کام کے لئے آئے ہیں؟" اس نے پوچھا

"آیا نہیں ہوں بلایا گیا ہوں ... سیٹھ صاحب کا خط گیا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے بمبئی آکر ملئے۔ سو میں چلا آرہا ہوں"

کندن نے غور سے نووارد کو دیکھا "ہیرو" قسم کی شکل ہرگز نہیں تھی اور نہ وضع قطع "ایکٹرانہ" تھی۔ اس نے سوچا "شاید کوئی کیریکٹر ایکٹر ہو"

"آپ کو میں نے کسی فلم میں دیکھا نہیں ابھی تک، شاید ابھی آپ کی فلم نکلی نہیں ..."

"میں تو آج پہلی بار کسی اسٹوڈیو کے دروازے میں داخل ہوا ہوں"

"تو آپ کسی پکچر میں رول کے لئے ..."

"نہیں، نہیں، بھئی میں ایکٹر نہیں ہوں۔ میں کہانیاں لکھتا ہوں"

"کون کون سی کہانیاں فلم ہوئی ہیں آپ کی؟"

"کوئی بھی نہیں، میری کہانیاں اب تک چھپتی رہی ہیں فلمائی نہیں گئیں"

"آپ کا نام؟"

"میرا نام تو یادھو سنگھ ہے، مگر میں نرمل کے نام سے لکھتا ہوں"

نرمل؟ نرمل؟ ... نرمل!

تو یہی اردو اور ہندی کا مشہور مصنف نرمل تھا۔ جس کے افسانوں ناولوں اور ریڈیو ڈراموں کی تمام ملک میں دھوم تھی، جس کے رومانی انداز بیان نے ہزاروں لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز کر دی تھیں، اور ہزاروں لڑکیوں کی راتوں کی نیندیں اچاٹ کر دی تھیں۔ کندن خود کب سے نرمل کے مداحوں اور نادیدہ پرستاروں میں سے تھا۔

نرمل ؟ مگر نرمل تو ایک باغی ادیب تھا۔ اپنی انقلابی تحریروں کی وجہ سے دو بار جیل جا چکا تھا۔ اپنے ناول "جنت میں جہنم" کی وجہ سے ریاست کشمیر میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کی کئی کتابیں ضبط ہو چکی تھیں اور ان میں سے دو ایک کو تو قومی حکومت بھی خطرناک سمجھتی تھی کیونکہ ان میں مزدوروں اور کسانوں کو انقلاب کی ترغیب دلائی گئی تھی۔

نرمل ؟ بھلا نرمل کا گریٹ آرٹ پکچرز کے اسٹوڈیو میں کیا کام ؟ کندن کسی طرح ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ "ہائے جانی" اور "ظالم جوانی" جیسی فلمیں بنانے والے سیٹھ جی نرمل کی کسی کہانی کو بھی فلمانے کے لئے تیار ہو جائیں۔

"تو، نرمل جی، آپ فلم کے لئے کہانی لکھیں گے ؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ لکھوں گا نہیں بلکہ لکھ چکا ہوں۔ وہی تو آج سیٹھ جی کو سنانے آیا ہوں۔"

"کیا نام ہے آپ کی کہانی کا ؟"

"سرخ سویرا؟"

"سرخ سویرا؟ بڑا اچھا نام ہے! ... ایک بات پوچھوں، نرمل جی اگر آپ بُرا نہ مانیں؟"

"ہاں، ہاں۔ پوچھو، بھئی"

"اس کہانی میں میرے جیسے لڑکے کے لئے کوئی کام نکل سکتا ہے؟"

نرمل نے اپنی دہکتی ہوئی آنکھیں کندن کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اور کندن کو ایسا معلوم ہوا کہ باغی ادیب کی نظر اس کے دل اور دماغ کے کونے کونے کو ٹٹول رہی ہے۔ مڈل کے امتحان میں جب وہ شریک ہوا تھا تب بھی اُسے اتنی گھبراہٹ نہ ہوئی تھی۔

"کسی فلم میں کام کیا ہے؟" نرمل نے دفعتاً سوال کیا۔

"جی ... ابھی ... تک ... تو کسی نے چانس نہیں دیا"

کندن نے ڈرتے ڈرتے اقرار کیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ اگر کسی اور فلم میں کام نہیں کیا تو میری کہانی میں ضرور کام کر سکتے ہو ... مجھے کاٹھ کے پتلے اور رنگین تتلیاں نہیں انسان چاہئیں انسان"

"تو پھر مجھے کون سا پارٹ مل جائے گا؟"

اور وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا۔ کاش مجھے کسی نوکر کا نہیں بلکہ ہیرو کے دوست کا پارٹ مل جائے!

مگر نرمل نے جو جواب دیا اس کے لئے کندن بالکل تیار نہ تھا۔

"میرے خیال میں میری کہانی کے ہیرو کے لئے تمہارے جیسا ہی لڑکا چاہیئے"

مسرت کی ایک سنسناہٹ بھری لہر کندن کے تمام بدن میں دوڑ گئی۔ کیا زندگی کے سارے خواب ایک ہی دن میں سچے ہو سکتے ہیں؟ پہلے مس نازنین کی میٹھی میٹھی باتیں اور اب نرمل جیسے مشہور ادیب کی یہ نوازش!

ابھی وہ اپنے نئے محسن اور کرمفرما کا شکریہ بھی ادا نہیں کر پایا تھا کہ سیٹھ جی کی کار کا ہارن سنائی دیا اور وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس کی ساری امیدوں کا دارومدار سیٹھ جی کی نظر عنایت پر ہی تھا۔

سفید ریشمی کوٹ (جس میں سونے اور ہیرے کے بٹن لگے ہوئے تھے) سفید دھوتی اور سیاہ ٹوپی پہنے سیٹھ جی کار سے اترے برامدے کی سیڑھیوں پر پان کی پیک تھوکی۔ اور بغیر کندن یا نرمل کی طرف دیکھے سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ دفتر سے دو تین کلرک اور چپراسی فائلیں، خطوط کے پلندے وغیرہ لئے دوڑے سیٹھ جی کی ایک گونجتی ہوئی ڈکار سنائی دی اور اس کے بعد ٹیلیفون کی چرخی گھمانے کی گرگراہٹ۔ سیٹھ جی نے اپنے ذاتی ٹیلیفون پر اپنے اسٹاک بروکر سے سٹے کی بات چیت شروع کر دی۔ کوئی کوئی لفظ باہر بھی سنائی دیتا تھا" ... تیجی منڈی ... خریدو ... نیچے ... ایک سو انیس ... نیویارک کاٹن ... کور (Cover)

کرو گور ... "

نرمل نے کندن کی طرف دیکھا اور کندن نے نرمل کی طرف۔

باغی ادیب نے "سرخ سویرا" کا پلندا جو اپنے تھیلے سے آدھا باہر نکال لیا تھا پھر اندر ٹھونس دیا۔

ایک چپراسی باہر آیا تو کندن نے اُسے روک کر کہا "دیکھو یہ نرمل جی بڑے لیکھک ہیں سیٹھ جی کے بلانے سے آئے ہیں، ان کا نام تو اندر پہنچاؤ"

چپراسی نے نرمل پر اوپر سے نیچے تک پریشان بالوں سے لے کر پیوند لگے ہوئے چپلوں تک اس طرح حقارت سے نظر ڈالی جیسے کہہ رہا ہو۔

"بہت دیکھے ہیں ایسے ایسے منشی!"

"کارڈ ہے تمھارے پاس؟"

"کارڈ تو نہیں ... "

"ہنہہ! ... یہ لو، نام لکھو"

نرمل نے پرچی پر نام لکھ کر چپراسی کو دیا اور پھر بنچ پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ کے بعد چپراسی آیا اور اس بار کسی قدر کم بدتمیزی سے بولا۔

"بلاتے ہیں سیٹھ جی"

نرمل اندر گیا تو چپراسی نے کندن سے پوچھا

"تم کو کیا چاہیے؟"

میں تو اسٹوڈیو ہی کا آدمی ہوں، بھئی۔ لائٹ ڈپارٹمنٹ میں کام کرتا ہوں۔ مات سیٹھ جی نے سیٹ پر کہا تھا سویرے ہمیں آفس میں ملو۔"

"ہنہ! ۔ لائٹ قلی!" چپراسی نے اس طرح کہا جیسے کسی مکوڑے کو ایک بھاری جوتے تلے دبا کر مسل دیا جائے اور بیڑی سلگاتا ہوا ہوٹل کی طرف چلدیا۔

پر کندن نے اس کی پرواہ نہ کی۔ بلکہ یہ سوچ کر مسکرایا "کل اسی چپراسی کو مجھے جھک کر سلام کرنا پڑے گا۔ اس بیوقوف کو نہیں معلوم کہ میں اس کمپنی کی اگلی فلم کا ہیرو ہوں ہیرو!"

# چوتھا ریل

(جس میں ہیرو ہیروئن کو چھوڑ کر ایک سنہری تتلی کی طرف بھاگتا ہے)

اندر کمرے میں سیٹھ جی نرمل سے سوال جواب کر رہے تھے۔

"ہاں تو تمہاری اسٹوری کا کیا نام ہے، منشی جی؟"

"دیکھئے میں منشی نہیں ہوں ... "

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ اپنے ہاں بڑا بڑا منشی کام کر چکا ہے۔ منشی کھنجر، منشی مستانہ، منشی پریمی، منشی پردیسی ... ... ہاں تو کیا نام ہے اسٹوری کا؟"

"سُرخ سویرا"

"سرکھ بسیرا؟"

"جی ہاں سرخ سویرا۔ مطلب ہے کہ آزادی اور انقلاب کی صبح نو ..... "

سیٹھ صاحب کچھ نہیں سمجھے۔ بات کاٹ کر بولے: "نا، نا۔ یہ نہیں چلے گا۔ سرکھ بسیرا یہ تو ریڈ سگنل جیسا نام ہے۔ کوئی سمجھے گا ہم نے اسٹنٹ پکچر بنایا ہے"

"سیٹھ صاحب، یہ دوسری قسم کا ریڈ سگنل ہے۔ یہ سرخی خون کی سرخی ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کا خون ... خونی شفق"

"خونی عاشق!" سیٹھ صاحب چونک کر بولے: "یہ فلم تو ہم دس برس ہوئے بنا چکا ہے۔ دیکھو، منشی جی ... "

"میں نے آپ سے کہا نہیں کہ میں منشی نہیں ... "

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ وہ منشی کھنجر بھی یہی بولتا تھا۔ ہاں تو تم نے نیو تھیٹر کا فلم "ہمراہی" دیکھا ہے۔ پہلے یہ فلم بنگالی میں اتارا تھا۔ نیا ہیرو۔ نیا ہیروئن۔ نہ گانا نہ ڈانس۔ سب بولتا ہو چار ویک بھی چلے تو بہت ہے۔ پر جانتے ہو کلکتے میں کتنا چلا۔ سال بھر۔ پورے سال بھر۔ ابھی بومبے میں ہندستانی میں چلتا ہے، ہم بھی دیکھنے گیا۔ بالکل بنڈل ہے ہیرو ایک دم کالا کلوٹا دیہاتی دکھتا ہے۔ بالکل رومانٹک نہیں۔ ہیروئن گھوڑی جیسی دکھتی ہے۔ اس سے تو اپنی شانتا رن زیادہ سندر ہے۔ گانا اپنے مدھوک بابو جیسا ایک بھی نہیں پھر بھی گیارہ رش لے رہا ہے۔ جب

دیکھو، ہاؤس فل، ... ناجانے پبلک کیوں اتنا تالی مارتا ہے، ہمارا ڈائرکٹر باسو بولتا ہے اس میں سیٹھ لوگوں اور پیسے والوں کو گالی دی ہے سو پبلک تالی مارتا ہے۔ سو اپنے کو بھی ایسی ہی اسٹوری مانگتا۔ ہم بھی سیٹھ ہے پر تم سیٹھ لوگوں کو جتنی چاہے گالی دو۔ ہاں دس گانے مانگتا اور پھر کم سے کم سلور جوبلی ہٹ ہونا چاہئے ''

سیٹھ صاحب کی تقریر سن کر بے چارہ افسانہ نگار لاجواب بلکہ مبہوت ہو چکا تھا۔ ڈرتے ڈرتے بولا " دیکھئے میں کہانی لکھتے وقت کسی کی نقل نہیں کرتا۔ ہمراہی، میں نے دیکھا ہے۔ اچھا خاصا فلم ہے مگر نفسیاتی لحاظ سے اس میں چند بنیادی کمزوریاں ... "

" ہوگا۔ ہوگا " سیٹھ صاحب نے جلدی سے بات کاٹتے ہوئے کہا " تم اپنی اسٹوری ہی لکھو۔ ہم سنتا تم سوشلسٹ لیکھک ہو۔ سیٹھ لوگوں کو ایک دم گالی دیتے ہو ... "

" میں گالی نہیں دیتا ہوں، سیٹھ صاحب۔ میں سماج کی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہوں ... "

" اور دیکھو اتنا کٹھن ڈائلاگ نہیں چلے گا۔ اپنے کو ایسا ڈائلاگ چاہئے جو کشمیر سے لے کر مدراس تک سب ایک دم سمجھ جائیں "

" پہلے کہانی تو سن لیجئے، پھر ڈائلاگ کی بات کیجئے گا "

سیٹھ صاحب نے گھڑی کی طرف دیکھا اور کھڑے ہو گئے، " دیکھو آج تو اپنے کو ٹائم نہیں ہے۔ جرا شیر بازار جانا ہے۔ پھر کسی دن سنے گا، آج

تم ڈائرکٹر باسو کو اسٹوری سناؤ۔ جیسا وہ بولے ویسا چینج کر کے پھر ہمیں سنانا۔" بیسو۔ بیسو۔ ہنی بیسو"۔۔ بیساختہ گجراتی بولتے ہوئے سیٹھ صاحب کمرے سے باہر نکل آئے۔

کندن جو اسی انتظار میں بیٹھا ہوا تھا سیٹھ صاحب کی طرف لپکا۔

"سیٹھ جی، نمستے"

"نمستے، نمستے۔ کیا ہے؟"

"آپ نے بلایا تھا نا۔ رات سیٹ پر آپ بولے سویرے ہمیں ملو"

"اچھا اچھا۔ تم وہ لائٹ والا چھوکرا ہے۔ تم اچھا کام کرتا ہے..."

کندن کا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔

"وہ لائٹ قلی کا کام اچھا نہیں ہے۔ تم کو کوئی دوسرا اچھا کام دے گا"

نرمل کو ہیرو بننے کا خواب سچا ہوتا نظر آیا۔ اور پھر ایک لمحے میں امیدوں کے اونچے سنہری محل مٹی میں مل گئے۔

"آج سے تم یہاں کام کرو۔ آفس کا ایک سپاہی ہے اِدھر، پر اپنے کو ایک اپنا پرائیوٹ چپراسی چاہیے ... اور پھر جاتے جاتے "ہاں، دیکھو۔ ڈائرکٹر باسو کو بولو وہ لیکھک نرمل جس کو ہم نے بلایا تھا اِدھر بیٹھا ہے۔ اس کی اسٹوری سن لیں"۔ یہ کہا اور موٹر میں بیٹھ سیٹھ جی چل دیئے۔

لائٹ قلی سے چپراسی! ... تو یہ ہوئی اس کی ترقی!...

پھر بھی ڈائرکٹر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں کندن نے سوچا کم سے کم روز سیٹھ اور دوسرے ڈائرکٹروں کے سامنے آنے کا موقعہ تو ملے گا۔ شاید کسی دن کسی کی نظر پڑ جائے اور وہ اپنے فلم کے کسی رول کے لئے منتخب کر لے۔

ڈائرکٹر باسو آرام کرسی پر لیٹے ایک امریکن فلمی میگزین پڑھ رہے تھے۔ ان کو اسٹوڈیو میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور قابل آدمی سمجھا جاتا تھا۔ بی۔ اے میں پڑھتے تھے جب گھر سے بھاگ کر فلم لائن میں آئے تھے۔ امریکن اور انگریزی فلمیں باقاعدگی سے دیکھتے تھے اور "ربیکا" یا "گون ود دی ونڈ" جیسے ناول بھی پڑھ لیتے تھے۔ تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے، ٹیگور یا سرت چندر چٹرجی کی ایک آدھ کتاب ساتھ رکھتے تھے تاکہ ان کی ادب شناسی کا سکہ سب پر بیٹھ جائے۔ ہمیشہ سلک کا کرتا اور ململ کی دھوتی اور اوپر ایک کشمیری شال میں ملبوس نظر آتے تھے تاکہ لمبے بالوں کے ساتھ اس لباس سے بھی فنکارانہ ماحول بنا رہے۔

نرمل نے سیٹھ صاحب کا پیغام ڈائرکٹر باسو کو پہنچا دیا، اور پھر ایک پیالی چائے پینے کے لئے ہوٹل کی طرف چلا۔ ہوٹل کے سامنے ایک درخت کے نیچے گول چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر اکثر اکسٹرا لڑکیاں بیٹھی رہتی تھیں۔ نرمل عام طور سے ادھر سے کترا کر ہی نکل جاتا تھا کیونکہ اس نے سنا تھا کہ یہ لڑکیاں بڑی آوارہ اور بدمعاش ہوتی ہیں، فلموں میں کام ملنے کے عوض اپنا جسم فروخت کرتی پھرتی ہیں اور کتنے ہی جنسی امراض کا شکار

ہوتی ہیں اس کے علاوہ وہ خود ہیرو بننے اور شکنتلا یا نازنین جیسی ہیروئن سے عشق کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ اسسٹنٹ کیمرہ مینوں اور اسسٹنٹ ڈائرکٹروں کی طرح اکسٹرا لڑکیوں کے چکر میں پڑ کر اپنی آئندہ ترقی کو کیوں خطرے میں ڈالنے لگا۔

آج ہوٹل میں بھیڑ اتنی تھی کہ بیٹھنے کو ایک کرسی بھی نہ تھی، اور پھر سابق لائٹ فلمی دھال چپراسی نرمل کے لئے بھلا کون کرسی خالی کرتا۔ مجبور ہو کر وہ باہر نکل آیا اور سوچا چند منٹ انتظار کرنے کے بعد جب کوئی جگہ خالی ہو گی تو پھر اندر چلا جائے گا۔ درخت کے نیچے حسب معمول چند اکسٹرا لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ نرمل نے جان بوجھ کر اُدھر پیٹھ کر لی اور سیٹھ جی کے دفتر کی چھت پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کا بغور مطالعہ کرنے لگا۔ پر اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی بہانے سے ایک بار اُدھر "نگاہ غلط انداز" ڈال لے شاید اتفاق سے کوئی اچھا چہرہ ہی نظر آجائے۔ کان اس کے اُدھر ہی لگے رہے۔

دو لڑکیاں باتیں کر رہی تھیں

"تو بوبے ٹاکیز میں کام نہیں چلا"؟ ... یہ آواز چنچل اور شوخ اور پنجابی تھی

"نہیں۔ اگلے ہفتے پھر بلایا ہے"، ... یہ آواز دھیمی اور مغموم تھی۔

"تعجب ہے کہ تم دادا گنجا کے ساتھ گئیں اور تمھارا کام نہ بنا"۔

"جب ان کو ضرورت ہی نہ ہو تو وہ کیا کر سکتا ہے؟"

"یہ تو نہ کہو۔ جس لڑکی سے اس کا تعلق ہو جائے اس کے لئے جان لٹا دیتا ہے۔"

"میرا اس کا کوئی تعلق نہیں ہے"۔ یہ الفاظ بھی اس نامعلوم لڑکی کی زبان سے جھجکتے ہوئے نکلے اور نہ جانے کیوں نرمل کو اس آواز میں وہی معصومیت، وہی حیا سنائی دی جو سویرے اس لڑکی کے چہرے پر دکھائی دی تھی جو دادا گنجا کی موٹر کے پاس کھڑی تھی۔

چنچل اور شوخ ہنس کر بولی "بہن ابھی نئی ہو۔ جبھی ایسی باتیں کرتی ہو"

پھر تھوڑی دیر خاموشی

"کب تک انتظار کرنا پڑے گا؟"

"کون جانتا ہے۔ صبح سے شام ہو جاتی ہے اور ڈائریکٹر صاحب کو اکسٹرا لڑکیوں کا چناؤ کرنے کی فرصت نہیں ملتی"

"بھوک لگی ہے۔ بس صبح ایک پیالی چائے پی تھی"

"مجھے خود۔ پر پتہ نہیں پیسے بھی ہیں یا نہیں۔ یہاں تو ایک توس بھی دو آنے کا ملتا ہے"

پھر بٹوؤں سے پیسے نکالنے اور گننے کی آواز۔

"دس آنے ہیں، چار آنے واپسی کے لئے چاہئیں۔ چھ آنے میں کیا ملے گا" اور اس بار نرمل نے محسوس کیا کہ چنچل اور شوخ آواز اتنی

چنچل اور شوخ نہ رہی تھی۔

"میرے پاس تو بس چھ آنے ہیں۔ ٹرام میں بھی گئی تو گھر پہنچنے کے لئے چھ پیسے چاہئیں"

"تو کوئی بات نہیں۔ ایک ایک آملیٹ کھا لیتے ہیں" ...

اور پھر آواز کا نشانہ نرمل کی طرف۔

"اے مسٹر!"

اب تو نرمل کو مڑ کر دیکھنا ہی پڑا۔ چنچل اور شوخ آواز والی جس نے اُسے پکارا تھا خاصی قبول صورت مگر کسی قدر چھوٹی آنکھوں والی نکلی۔ اس نے میک اپ، بالوں کے سنگھار، ساڑھی باندھنے کے انداز اور گردن کے خم سے شانتارن سے مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی ساتھ والی وہی لڑکی تھی جسے نرمل نے صبح اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا تھا۔ قریب سے وہ اور بھی بھلی نظر آئی اور باوجودیکہ نہ اس کے چہرے پر پینٹ پاؤڈر تھا نہ کوئی زیور، ساڑھی بھی معمولی سوتی گھر کی دھلی ہوئی، پھر بھی اس کا معصوم اور قدرتی حسن نہایت دلکش تھا۔

نرمل کو یاد آیا کہ اکسٹرا لڑکیاں نوجوانوں کو "پھانسنے" کے نت نئے طریقے اختیار کرتی ہیں۔ اس لئے اُس نے کافی درشتی سے جواب دیا "کیوں کیا ہے؟"

نقلی شانتارن نے بناوٹی ناز و انداز سے منہ بنا کر کہا "اجی سرکار اتنے بگڑتے کیوں ہیں۔ آپ سے بس اتنا پوچھنا ہے کہ اس ہوٹل میں آملیٹ

کتنے کا ملتا ہے "

"میں کوئی ہوٹل کا چھوکرا ہوں ؟" نرمل نے اپنی سفید قمیص اور پتلون کو جتاتے ہوئے سختی سے کہا - اور پھر گڑبڑا کر بے ساختہ "بارہ آنے کا ملتا ہے " اور اس پر مغموم حسن کے چہرے پر بھی ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی -

نرمل نے پھر منہ پھیر لیا - دونوں لڑکیوں میں آملیٹ کے اقتصادی مسئلے پر بات چیت شروع ہو گئی - طے یہ ہوا کہ دونوں مل کر ایک آملیٹ ہی منگا کر کھالیں اور کمی پوری کرنے کے لئے دونوں بس کے بجائے ٹرام میں گھر واپس جائیں - ہوٹل کے چھوکرے کو آرڈر دے دیا گیا -

"کیوں بہن تمہارا نام کیا ہے ؟ شوخ اور چنچل نے پوچھا

"اندرا - اور تمھارا ؟ "

"ماں باپ تو کمو کمو پکارتے تھے پر اب میں کومیتا کماری کہلاتی ہوں "

"اندرا ! " اچھا شریفانہ نام ہے " کندن نے سوچا " اچھی بھلی لڑکی معلوم ہوتی ہے - اس سے ملاقات بڑھائی جائے تو کیسا رہے ؟ مگر اسٹوڈیو والے تو یہی کہیں گے کہ ایک اکسٹرا لڑکی کو پھانس ... ... "

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سیٹھ کے کمرے کی طرف سے ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور کندن بے تحاشہ بھاگا - یہ ضرور نازنین کا فون ہو گا -

مگر اس کا قیاس غلط نکلا۔ یہ تو گمن لال ڈریس والا کی دوکان سے پروڈکشن منیجر کے لئے پیغام آیا تھا کہ دس ناچنے والیوں کے گھگھرے سل کر تیار ہو گئے ہیں مگر چولیاں کیسے سل سکتی ہیں جب تک سب اکسٹرا لڑکیاں اپنا ناپ دینے خود نہ آئیں۔

کندن نے یہ پیغام پروڈکشن منیجر کو پہنچا دیا جو بیٹھا ہوا لڑکیوں کی تصویروں کے گڈے سے تاش کی طرح کھیل رہا تھا۔ وہ بولا "لڑکیوں کو ناپ دینے کے لئے کہاں سے بھیجوں جب ابھی تک اُن کا چناؤ ہی نہیں ہوا، آج ڈھنگ کی صورت شکل لڑکی کہاں ملتی ہے، اور پھر ڈانس کے واسطے بدن بھی تو چاہئے۔ یہاں تو جسے دیکھو، سوکھا، چُسا ہوا آم یا منڈی پھوس، کہہ دو اپنی مرضی سے جس ناپ کی چاہے بنا دیں۔ بعد میں ٹھیک کروالیں گے۔ اور کچھ نہیں تو روئی بھر دیں گے"

کندن نے جاتے جاتے پروڈکشن منیجر کے کان میں یہ بات ڈال دی "اچھی صورت شکل کی لڑکیاں چاہئیں تو دونوں آپ کے دفتر کے باہر ہی بیٹھی ہیں"

گمن لال ڈریس والا کو جواب دے کر فون بند ہی کیا تھا کہ گھنٹی پھر بجنے لگی۔

"گریٹ آرٹ پکچرز۔ کون چاہئے آپ کو؟"

"دیکھو مس نازنین سے کہہ دو کہ ان کی سہیلی کملا نے انھیں شوٹنگ کے بعد چھ بجے چائے پر بلایا ہے۔ تاج محل ہوٹل میں، بھول نہ جائیں"

"بہت اچھا۔ میں ابھی کہہ دیتا ہوں"

"اور سنو۔ یہ بات ذرا ان سے علیحدگی میں کہنا۔ اُن کی ماں یا نانی کے سامنے نہیں۔"

اس سے پہلے کہ کندن سوال کر سکتا کہ مس نازنین کی سہیلی کملا چھپا کر دعوت کیوں کر رہی تھی، فون کٹ گیا۔ اور وہ دل ہی دل میں اس مسئلے پر غور کرتا ہوا اسٹوڈیو کی طرف گیا جہاں ڈائرکٹر ہنڈا کے فلم "تتلی" کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔

"ریہرسل!" ڈائرکٹر رام پرشاد ہنڈا شمال مغربی پنجاب کا رہنے والا تھا اور اس کی آواز میں پٹھانی قسم کا کرخت رعب داب تھا۔

نازنین کا کلوز اپ لیا جانے والا تھا۔ وہ درجنوں روشنیوں کے جھرمٹ میں کھڑی کیمرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہی تھی "میں تمھارے پریم کے لئے دنیا کی ہر چیز بلیدان کر سکتی ہوں، منگو۔ دھن دولت۔ ماں باپ گھر بار۔"

اور نازنین کی نانی چنیا بائی دور کرسی پر بیٹھی پان چباتے ہوئے منشی پردیسی سے کہہ رہی تھیں (جو فلمی مکالمہ نویس بننے سے پہلے درزی کا کام کرتا تھا) "واہ منشی جی۔ کیا ڈائلاگ لکھو ہو۔ بس طبیعت پھڑک جاوے ہے سن کے"

"او کے فار ساؤنڈ"

"میک اپ"

نازنین کا میک اَپ درست ہو رہا تھا جب اس نے دیکھا کہ کندن اس سے کچھ کہنے کا انتظار کر رہا ہے۔ اُس نے میک اَپ والے سے کہا "ذرا ڈریسنگ روم سے میرا بیگ تو اٹھا لانا" حالانکہ بیگ تو وہیں اسٹوڈیو میں اس کی ماں کے پاس تھا۔ جیسے ہی میک اپ والا ٹلا نازنین نے ہلکی آواز میں کندن سے پوچھا "کیوں کوئی فون آیا؟"

"جی ہاں۔ آپ کی سہیلی کملا نے چھ بجے آپ کو چائے پر بلایا ہے۔ تاج محل ہوٹل میں۔ تاکید کی ہے کہ بھول نہ جائیں"

"چھ بجے!" اور کندن نے نازنین کے چہرے پر کچھ ایسے آثار دیکھے جیسے وہ دل ہی دل میں کوئی حساب لگا رہی ہو یا شاید کوئی فیصلہ کر رہی ہو۔ پھر وہ بولی "شاباش۔ کسی اور سے مت ذکر کرنا"

ابھی کندن جواب میں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ اس کی جان بھی چلی جائے تو مس نازنین کا کوئی راز اس کی زبان سے نہیں نکل سکتا کہ میک اپ والا واپس آگیا "جی وہاں تو آپ کا بیگ نہیں ملا ... ..." کندن واپس چلا آیا۔

سیٹھ صاحب کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو زمل اپنی کہانی پڑھ رہا تھا اور ڈائرکٹر ہاسوسر پرستانا انداز میں "ہاں ___ ہوں ___ یس ___ ناٹ بیڈ" وغیرہ کہتے جا رہے تھے۔

زمل ایک سین سنا رہا تھا۔

"کلو مفلس ہے، مگر وہ بھیک نہیں مانگتا۔ وہ چوری بھی نہیں کرتا، وہ اپنا حق مانگتا ہے۔ مزدوروں کو جمع کر کے وہ کہتا ہے "بھائیو!

ہم اپنے خون پسینے سے ....."

وہ اتنا ہی سن پایا تھا کہ فون کی گھنٹی پھر بجی اور وہ اُدھر بھاگا۔ یہ وہی مس نازنین کی مردانہ آواز والی "سہیلی" کملا تھی۔ "کیوں مس نازنین سے کہہ دیا نا؟"

کندن نے اطمینان دلایا کہ پیغام پہنچا دیا گیا ہے "کسی اور کے سامنے تو نہیں کہا؟" ۔ نہ جانے یہ مردانہ سہیلی نازنین کی دعوت اتنے خفیہ طریقے سے کیوں کر رہی تھی! خیر کندن کو اس سے کیا غرض۔ اُس نے پھر یقین دلایا "نہیں جی! میں ایسا بے وقوف تھوڑا ہی ہوں۔ بالکل اکیلے میں کہا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں"

پھر وہ مردانہ کملا کا جواب سن کر دنگ رہ گیا "تو پھر جیو میری جان!" اور فون کا سلسلہ کٹ گیا۔

پروڈکشن منیجر کے کمرے سے ایک نرم سی، پہچانی ہوئی سی آواز آئی۔ کندن نے اُدھر جھانکا تو دیکھا کہ وہی معصوم اور مغموم آنکھوں والی اندرا ہے وہ کہہ رہی تھی "آپ سوچ لیجئے۔ کام کرنے کو میں تیار ہوں۔ مگر مجھے تجربہ بالکل نہیں ہے اور ناچنا تو مجھے ذرا بھی نہیں آتا ....."

اور پروڈکشن منیجر کہہ رہا تھا "آپ کیا بات کرتی ہیں، مس اندرا۔ آپ تو بہت جلد ہیروئن ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے اگلی ہی پکچر میں۔ صرف ....."

اور یہ کہہ کر وہ ٹھیرا معنی خیز انداز سے اندرا کی طرف دیکھا اور پھر بولا "صرف ذرا محنت کی ضرورت ہوگی"

"محنت تو میں جتنی کہئے اُتنی کرنے کو تیار ہوں"۔ وہ 'محنت' کے معنی نہ سمجھتے ہوئے بولی "چاہے دس بار ریہرسل کرا لیجئے۔ 'ڈائلاگ' تو میں چند منٹ میں یاد کر کے سنا سکتی ہوں ....."

پروڈکشن مینجر نے نہایت تھکی ہوئی آواز میں کہا "اچھا تو جاؤ۔ کل ملنا"۔ اور جب اندرا نمسکار کر کے جانے لگی "ابھی بہت ناتجربہ کار ہو تم!"

اندرا باہر نکلی تو کندن سے تقریباً ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ شاید اُسے وہ آملیٹ والی بات اور کندن کی بوکھلاہٹ یاد آ گئی۔ اور وہ مسکرا دی۔

کندن کو بات کرنے کی ہمت ہوئی "کہئے کنٹراکٹ ہو گیا آپ کا؟"

"نہیں ابھی کنٹراکٹ کی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ مگر پروڈکشن مینجر صاحب نے امید بہت دلائی ہے۔ کہتے ہیں شاید اگلی پکچر میں مجھے ہیروئن کا کام مل جائے۔"

اور پہلی بار کندن نے اُن غمگین آنکھوں میں امید کی جھلک دیکھی۔ اور اس کا جی نہ چاہا کہ یہ کہہ کر کہ پروڈکشن مینجر تو یہی بات تقریباً ہر روز کسی نہ کسی ایکسٹرا لڑکی کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے اس سے کہا کرتا ہے۔ امید کی جھلک کو بھی ختم کر دے۔ اس نے صرف اتنا کہا "بھگوان کرے ایسا ہی ہو"

اسٹوڈیو کی گھنٹی دیر تک بجی۔ کام ختم۔ چھٹی۔ اب نازنین نکلے گی شاید اس سے کچھ بات کرے۔ کندن ایکسٹرا لڑکی کو چھوڑ ہیروئن کی زبان سے دو لفظ سننے کی آرزو میں اسٹوڈیو کی طرف بھاگا۔ نازنین کی ماں اور نانی ڈائرکٹر ہنڈا کو گھیرے کھڑی تھیں اور "مونڈی کاٹے" پبلسٹی مینجر کی حجامت اب تک ہو رہی تھی۔ نازنین اپنا بیگ ہاتھ میں لٹکائے ڈریسنگ روم میں داخل ہوا ہی چاہتی

تھی کہ کندن پہنچ گیا۔

"کوئی اور کام تو نہیں ہے آپ کو؟" اُس نے ہکلا کر پوچھا۔ کاش اس وقت وہ کہے کہ آسمان کے تارے توڑ لاؤ! مگر خیر اگر وہ یہ بھی کہے کہ میرے جوتے پر سے گرد صاف کرو تو وہ اسے بھی اپنی خوش قسمتی سمجھتا۔

"تو بڑا سمجھدار چھوکرا ہے" ناز نین نے کہا۔ اور گو کندن اپنے آپ کو "چھوکرا" نہیں پورا آدمی سمجھتا تھا وہ اپنی یہ تعریف سن کر پھولا نہ سمایا۔ اب اسے یقین ہو چلا کہ ناز نین اُسے اپنا دوست اور ہمراز سمجھتی ہے۔

مگر اگلے لمحے وہ آرزوؤں کے آسمان سے حقیقت کی زمین پر آ رہا۔ دھماکے کے ساتھ۔ بلکہ جھنکار کے ساتھ۔ اس چاندی کے روپے کی جھنکار کے ساتھ جو ناز نین نے اس کی طرف ایسے پھینکا۔ جیسے کتے کو روٹی کا ٹکڑا پھینکتے ہیں۔ ایک کارآمد قلی کو معقول انعام دے کر وہ اندر چلی گئی۔ اور کندن ——— لاجواب اور گونگا ہو کر ——— کئی منٹ تک زمین پر پڑے ہوئے اس چاندی کے روپے کو دیکھتا رہا جس پر بادشاہ کا چہرہ گویا اس کا مُنہ چڑا رہا تھا۔

# پانچواں ریل

(جس میں ہیروئن ہیرو کو اپنے کاشانۂ عشرت میں بلاتی ہے)

اگلے دن کندن اسٹوڈیو پہنچا تو دو گرما گرم خبریں ملیں۔ نرمل کمار کی کہانی "سرخ سویرا" پانچ ہزار میں خرید لی گئی اور اب وہ ڈائرکٹر باسو کے ساتھ مل کر سینیریو اور مکالمہ لکھنے والا تھا۔ اب تو شاید پچ مچ کندن کو ہیرو بننے کا موقعہ مل جائے!۔ مگر دوسری خبر اس سے کہیں زیادہ سنسنی خیز تھی۔

نازنین کی ماں نے سیٹھ جی کو فون کیا تھا۔ سیٹھ جی نے گھر میں واویلا مچایا تھا۔ سیٹھ جی کے ڈرائیور نے پروڈکشن منیجر کو خبر پہنچائی تھی۔ پروڈکشن منیجر نے ڈائرکٹر ہنڈا سے کہا تھا کہ آج اس وجہ سے شوٹنگ نہیں ہو گی۔ ڈائرکٹر ہنڈا

نے اپنے دو اسسٹنٹ ڈائرکٹروں رام اور چوپڑا سے کہا تھا کہ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ چوپڑا نے میک اپ والے کو رازدار بنایا تھا۔ میک اپ والے نے ایک اکسٹرا لڑکی کو جس سے اُس کی آشنائی تھی۔ اس لڑکی نے چار دوسری اکسٹرا لڑکیوں کے کانوں میں یہ بات گھس پُھسائی تھی۔ غرض چند ہی گھنٹے میں نہ صرف گریٹ آرٹ پکچرز بلکہ رنجیت، سپریم، شری ساونڈ اور واور کے ہر اسٹوڈیو میں یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ نازنین بھاگ گئی ہے۔

نازنین بھاگ گئی ہے!

نازنین بھاگ گئی ہے!!

مگر کس کے ساتھ؟ کسی کا بیان تھا کہ حیدرآباد کے کسی جاگیردار کے بیٹے کے ساتھ۔ کسی کا کہنا تھا، اپنے ڈرائیور کے ساتھ، کوئی ایک مشہور فلمی ہیرو کا نام لیتا تھا۔ کوئی ایک مقامی مسلم لیگ لیڈر کو ذمے دار ٹھیراتا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ تمام اسٹوڈیو میں کھلبلی مچی ہوئی تھی گو دبی ہوئی آوازمیں۔

مردانہ آوازوالی سہیلی کملا۔ تاج محل ہوٹل۔ شام کے چھ بجے، اُف! اس نے اپنے ہاتھ سے پیر پر کلہاڑی ماری تھی۔ اور کندن کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے ساتھ دغا کی گئی ہو۔ اس کے جذبات کو مٹی ... نہیں نہیں کیچڑ ... میں مسل دیا گیا ہو۔ جیسے ... جیسے ہیروئن ہیرو کو چھوڑ کر بدمعاش ولین کے ساتھ بھاگ گئی ہو۔ اُف بے وفا دنیا! اُف دغا باز عورت!! ... وغیرہ وغیرہ تمام فلمی مکالمے اس کے دماغ میں آتے رہے۔

مگر تھوڑی دیر کے بعد اس نے سوچا ممکن ہے اس کے دماغی فلم کی

ہیروئن نازنین نہ ہو کوئی اور ہو اور نازنین صرف "سائڈ ہیروئن" یا ممکن ہے بس ایکسٹرا ہی ہو۔ تو پھر اس کی ہیروئن کون ہے؟

"میں نے کہا نمستے کندن جی"،

یہ اندرا تھی۔ وہی خاموش اور حیادار آنکھوں والی اندرا۔ نہیں نہیں یہ گھر کی دھلی ہوئی سوتی ساڑھی پہننے والی ایکسٹرا لڑکی کندن کمار (ہونے والے فلم اسٹار) کی ہیروئن کیسے ہو سکتی ہے؟ اس نے جواب میں سوکھا سا "نمستے جی نمستے"، کہہ کر ٹالنا چاہا۔

"کہیے آج بھی پروڈکشن منیجر صاحب کے درشن ہو سکیں گے یا نہیں؟"

لو یہ تو پیچھے ہی پڑ گئی۔ یہی تو ان ایکسٹرا لڑکیوں کی حرکتیں ہیں جن سے وہ اپنا شکار پھانستی ہیں۔

"آج تمھیں اسٹوڈیو میں کسی سے ملنے کا موقع نہ ملے گا۔ سب پریشان ہیں"،

"کیوں کیا ہوا، کندن جی؟"

کندن جی! کندن جی! کمبخت اس بے چارے کے پیچھے کیوں پڑ گئی تھی! مگر اس کی آواز میں اتنی ملائمت، اتنی التجا، اتنی معصومیت تھی کہ کندن کسی درشت جملے سے گفت گو کے سلسلے کو نہ کاٹ سکا۔

"کسی سے کہئے گا نہیں۔ معاملہ بڑا پرائیویٹ ہے ... ..." اور یہ کہہ کر نازنین کے بھاگ جانے کا واقعہ سنا دیا۔

"اتنی بڑی اور مشہور ایکٹرس بھاگ گئی اور کوئی نہیں جانتا کس کے

ساتھ؟ کتنے تعجب کی بات ہے۔"

اب کندن کو اپنی اہمیت جتانے کا موقع ہاتھ آیا۔ "کوئی نہیں جانتا سوائے ایک آدمی کے۔"

"وہ کون؟"

"وہ میں۔"

اور پھر رازدارانہ انداز میں اس نے ٹیلیفون کا واقعہ بھی سنا ڈالا، مردانہ آواز والی سہیلی مس کملا۔ تاج محل ہوٹل میں چائے کی دعوت وغیرہ اور یہ سن کر اندرا ——— مغموم اور عمیق آنکھوں والی اندرا۔ ہنس دی۔ کھلکھلا کر جیسے نازنین کا بھاگ جانا ایک ٹریجیڈی نہیں بلکہ کامیڈی ہو۔

"سب پریشان ہیں اور تم ہنس رہی ہو؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"معاف کرنا کندن جی۔ میں بس نازنین کی ماں اور نانی کا خیال کر کے ہنس رہی تھی۔ کتنی محنت سے انھوں نے اس سونا بنانے کی مشین کو تیار کیا تھا اور وہ مشین ایک آدمی کے ساتھ بھاگ گئی۔"

اور پوپلی چنیا بائی کا خیال کر کے کندن بھی ہنس پڑا۔ ماں اور نانی دونوں کی بری حالت ہو گی۔ نازنین بھاگ گئی تو ان کھوسٹوں کو کون پوچھے گا۔ فاقوں کی نوبت آ جائے گی۔ کندن کو ان دونوں زہریلی شہد کی مکھیوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ نازنین کی اس نازیبا حرکت کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ کہتا رہا۔ "پھر بھی اسے ماں، نانی، اسٹوڈیو، پکچر سب کو اس طرح چھوڑ کر نہ بھاگنا چاہئے تھا۔"

"کندن جی"۔ اندرا بولی اور پہلی بار اس کی معصوم اور میٹھی آواز میں زہر کی ہلکی سی تلخی بخی۔ "عورت کی زندگی میں ماں اور نانی، اسٹوڈیو اور پکچر سے بڑھ کر بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ محبت"

فون کی گھنٹی بجی اور وہ ادھر بھاگا۔

"گریٹ آرٹ پکچرز۔ آپ کو کون چاہیئے؟"

وہ گراموفون کے ریکارڈ کی طرح مکانیکی طریقے سے جواب دیتا رہا مگر اس کے دماغ میں اندرا کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"سیٹھ صاحب اسٹوڈیو میں نہیں ہیں۔ گھر فون کیجئے"

"کیا کہا؟ نمبر؟ ... مگر نمبر نہیں دیا جا سکتا۔ پرائیویٹ ہے" "آپ فلمی ہندستان کے اڈیٹر نہیں اگر لاٹ صاحب بھی ہوں تو سیٹھ صاحب کا پرائیوٹ نمبر نہیں دے سکتے"

"ہمیں کوئی اطلاع نہیں ہے کہ مس نازنین بھاگ گئی ہیں" فون پھر گھنٹی بجی۔

"نہیں مس نازنین شوٹنگ کو آج نہیں آئی ہیں"

"جی نہیں ان کے گھر کا نمبر بھی نہیں دے سکتا۔ بہت افسوس ہے۔ اور کوئی بات پوچھئے"

"ان کی ماں کا نام؟ نہیں معلوم۔ سب انھیں نازنین کی اماں کہتے ہیں۔ نانی کا نام؟ چنیا جان۔ جس پکچر میں کام کر رہی ہیں اس کا نام ہے تتلی ... مگر سنئے۔ عورت کی زندگی میں ماں اور نانی، اسٹوڈیو اور پکچر ...

سے بڑھ کر بھی ایک چیز ہوتی ہے! وہ کیا ہوتی ہے؟۔ یہ آپ خود سوچئے"۔

فون کا چونگا اٹھا کر الگ رکھ دیا تاکہ گھنٹی نہ بج سکے۔ معلوم ہوتا تھا کہ تمام بمبئی کے اخباروں کے ایڈیٹروں کو اس وقت صرف مس نازنین کی خیریت کی فکر پڑی ہوئی تھی۔

"آپ تو فلسفی معلوم ہوتی ہیں" کندن نے پھر اندرا کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"زندگی سب کچھ بنا دیتی ہے"

اب تو کندن کو اس عجیب و غریب معصوم شکل اور فلسفیانہ دماغ والی ایکسٹرا لڑکی میں دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا یہ پہلی لڑکی تھی جس نے اس سے سیدھے منہ بات کی تھی۔ پچھلی شام کا خیال کر کے اس کے کان لال ہو گئے۔ "چھوکرا!" کیا نازنین اسے کسی اور لفظ سے مخاطب نہ کر سکتی تھی؟ خیر لعنت بھیجو نازنین پر۔ اگر جارجیٹ اور بروکیڈ نہیں میسر تو سوتی ساڑھی ہی پر کیوں نہ اکتفا کی جائے۔۔۔ خصوصاً جب وہ اتنی اچھی دھلی ہوئی ہو!

"سنئے ایک بات کہوں اگر آپ برا نہ مانیں"

"کہئے"

"آج اسٹوڈیو میں تو کوئی آنے والا نہیں ہے۔ سب شکاری کتوں کی طرح بھاگے پھر رہے ہیں"

"ٹھیک ہے۔ مگر اس میں میرے برا ماننے کی کیا بات ہے"

"نہیں نہیں۔ وہ بات تو میں نے ابھی کہی ہی نہیں۔ میرا کہنا ہے کہ آج یہاں کام وام تو کچھ ہو گا ہی نہیں اس لئے ہم ... میرا مطلب ہے آپ میرے ساتھ سینما چلیں گی؟"

"چلی چلوں گی۔ مگر ایک شرط پر"

"وہ کیا؟"

"آپ مجھے میرے گھر پر چھوڑ کر آئیں گے"

"بڑی خوشی سے"

اس فلمی Situation کا کندن نے کتنی مدت سے مطالعہ کر رکھا تھا۔ ہیرو ہیروئن کو دعوت دیتا ہے۔ وہ منظور کر لیتی ہے۔ وہ دونوں تاج جا کر دیکھتے ہیں۔ وہ کشتی میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کرتے ہیں۔ ہوا سے ہیروئن کے بال اڑ رہے ہیں اور اس کے گورے بیضوی چہرے کے گرد ہالہ کئے ہوئے ہیں۔ اس کی ریشمی ساڑھی کا آنچل ہوا میں ایک انقلابی پرچم کی طرح اڑ رہا ہے۔ ہیرو اپنی صبا رفتار موٹر میں بٹھا کر ہیروئن کو جوہو لے جاتا ہے۔ ناریل کے اونچے اونچے درخت چاندنی رات میں ستاروں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے۔ فضا میں ایک رومانی نشہ۔ میں اور تو۔ تو اور میں ... وغیرہ وغیرہ۔

دفعتاً دماغ کی فلم گویا تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اور ٹٹول کر حساب لگایا کہ اس کے پاس صرف دو روپے تھے اس میں تو سینما بھی نو آنے والے ٹکٹوں میں دیکھنا پڑے گا۔ مگر خیر کوئی پرواہ

نہیں۔ ہیرو غریب ہے۔ پھر بھی ہیروئن کو ایک بڑے ریسٹوران میں لے جاتا ہے۔ ہیروئن کو معلوم ہے کہ اس کے پاس دام نہیں ہیں۔ اس لئے بیرے کے بل لانے سے پہلے وہ اپنے پلاسٹک کے بیگ سے ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر ہیرو کی جیب میں چپکے سے ڈال دیتی ہے۔ ... ...

امیر ہیرو غریب ہیروئن!

غریب ہیرو امیر ہیروئن!

مگر یہاں تو وہ دونوں غریب تھے۔ یہ Situation فلمی ڈھرے پر نہ چل سکے گی۔

"آئیے تو پھر کہیں چائے پی لیں"

ایرانی کی دکان۔ کنارے ٹوٹی ہوئی پیالیاں "گورنمنٹ کے دودھ یعنی پاؤڈر کی چائے۔ چاروں طرف میلے میلے کپڑے میلے میلے چہرے اور سب ان دونوں کو نہایت غیر مہذب طریقے سے گھورتے ہوئے۔

"آپ کو چنے پسند ہیں؟"

"جی ہاں۔ کیک پیسٹری ہیچ ہیں، خستہ بھنے ہوئے چنوں کے سامنے"

"ایک آنے کے چنے دینا، بھائی۔ ذرا گرما گرم"

دادر سے لمنگٹن روڈ کیسے جایا جائے؟ ...

"کہئے بس سے چلیں یا ریل سے یا ٹرام سے؟"

"ٹرام ہی سے چلئے۔ ابھی تو سنیما شروع ہونے میں بہت وقت ہے"

دومنزلہ ٹرام کی چھت پر آگے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے۔ تمام شہر بھاگا پیچھے جا رہا ہے۔ سینما سے زیادہ مزیدار تماشہ۔ اور کوئی دلچسپ ہستی ساتھ ہو تو چنے چبانا بھی ایک رومانی فعل ہو جاتا ہے۔

ہنستے، باتیں کرتے (نہایت غیر فلمی اور غیر رومانی قسم کی باتیں مثلاً یہ کہ ہمارے کرنال میں تو ایک پیسے میں اس سے دگنے چنے ملتے تھے یا یہ کہ راشن کی دوکان سے چاول اور گیہوں کس بھاؤ ملتے ہیں!) وہ لیمنگٹن روڈ پر پہنچے۔

"کون سا فلم دیکھیں؟"

"کوئی سا بھی۔ مجھے فلموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے"

"پھر بھی آپ فلموں میں کام کرنا چاہتی ہیں"

"پیٹ جو پالنا ہوا"

"آپ تو فلسفی معلوم ہوتی ہیں"

"یہ آپ پہلے بھی کہہ چکے ہیں"

"خیر چلیے۔ کلپنا دیکھیں"

"چلیے۔ میں نے اودے شنکر کی بہت تعریف سنی ہے"

پانچ آنے کے ٹکٹ ختم، دس آنے کے ٹکٹ ختم۔ سوا روپے کے ٹکٹ ختم۔ صرف ڈھائی روپے والے ٹکٹ مل سکتے تھے۔

بلیک مارکٹ! دس آنے کا ٹکٹ ایک روپے میں۔ دس آنے کا ٹکٹ ایک روپے میں! اور کندن کی جیب میں اب صرف ایک روپیہ آٹھ آنے

"چھوڑیئے۔ پھر کسی دن دیکھ لیں گے۔"

"مالا بار ہل ہینگنگ گارڈن دیکھنے چلتی ہیں آپ؟ سیر ہی ہو جائیگی"
اس نے خفت مٹانے کے لئے کہا۔

"چلئے۔ بجائے بند سینما میں دھوئیں اور زہریلے سانسوں کے سمندر کی تازہ ہوا کھائیں۔"

کتنی سمجھدار تھی یہ لڑکی! کوئی دوسری ہوتی تو سینما نہ دیکھنے پر ناک بھوں چڑھاتی اور نہ جانے کتنے نخرے کرتی۔

رج روڈ کے گھنے سایہ دار درختوں کی چھاؤں میں پیدل چلتے ہوئے وہ ہینگنگ گارڈن پہنچ گئے۔ مغربی کنارے پر کھڑے ہو کر غروب آفتاب کا منظر دیکھا۔ سماں اس قدر دلفریب تھا کہ کئی منٹ تک دونوں چپ چاپ کھڑے سمندر کی جانب دیکھتے رہے۔ اور کندن کو معلوم ہوا کہ کبھی کبھی خاموشی بھی بامعنی اور شیریں ہوتی ہے۔

واپسی پر اندھیرا ہو گیا اور سڑک کی روشنیاں چمک اٹھیں۔

"اب آپ کو مجھے گھر چھوڑ کر آنا ہوگا۔"

"کہاں رہتی ہیں آپ؟"

"بوری بندر کے قریب۔"

کندن نے سوچا وہ تو بڑھیا علاقہ ہے۔ شاید کسی اچھے فلیٹ میں رہتی ہوگی۔ اور اس کے تحت الشعور نے ایک اوباش کی طرح کھنکھار کر اور آنکھ مار کر کہا "شکار پھنس گیا۔"

بھلا اور کیوں ایک کنواری ایک نوجوان مرد کو رات کے وقت اپنے کاشانۂ عشرت میں آنے کی دعوت دینے لگی؟ "کاشانۂ عشرت" نہ جانے کسی شاعر کی نظم میں اس نے یہ جملہ پڑھا تھا۔ کاشانۂ عشرت! ریشمی گلابی لیمپ شیڈ۔ دھیمی دھیمی روشنی۔ فرش پر ایک نرم قیمتی قالین۔ دیوار پر چند خوبصورت عورتوں کی روغنی تصویریں۔ کونے میں ایک بڑا پلنگ سفید چادریں۔ سفید تکئے۔ ریشمی مسہری۔ نہ جانے کتنے ناولوں، افسانوں اور نظموں کو پڑھ کر اور کتنے فلموں کو دیکھ کر اس کے دماغ نے یہ کاشانۂ عشرت سجایا تھا!

ہاں تو بھلا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ایک کنواری ایک نوجوان مرد کو رات کے وقت اپنے کاشانۂ عشرت میں آنے کی دعوت دے؟

کندن کی مردانگی نے اُسے فتح کی مبارکباد پیش کی۔ کندن نے اپنے گالوں کو تمتمایا ہوا پایا۔ اپنے تمام بدن میں ایک سنسنی سی محسوس کی۔ جس گھڑی کا اسے کئی برس سے انتظار تھا، آرزو تھی، وہ آن پہنچی تھی۔ مگر مسرت کے ساتھ ایک ہلکی سی اُداسی اور مایوسی بھی، جیسے ایک طویل سفر ختم ہونے پر منزل اتنی خوش آئند نہ ثابت ہو جیسی امید تھی۔!

# چھاریل

(جس میں ہیروئن ہیرو کو گڑ کی چائے پلاتی ہے)

بوری بندر!

ٹرام سے اترے تو ان کے سامنے ایک نہ دو چھ سات راستے تھے۔ ایک تو بڑی سڑک جو ایک طرف سیدھی ریگل سینما، اپالو بندر اور تاج محل ہوٹل کی طرف جا رہی تھی اور دوسری طرف ٹائمز اوف انڈیا کے دفتر کے سامنے سے ہوتی ہوئی کرافورڈ مارکیٹ۔ ایک سڑک دھوبی تلاؤ جاتی تھی مگر اس راستے سے تو وہ ابھی آئے ہی تھے۔ ایک اور کیپٹل سینما کے برابر سے خالص ولایتی بمبئی جم خانہ کو۔ اور دوسری وکٹوریا ٹرمنس اسٹیشن کے سامنے

سے ہوتی ہوئی سینٹ جارج ہسپتال کو۔ مگر جس راستے پر اندرا اسے ساتھ لے کر چلی وہ کچھ اور ہی تھا۔

جنرل پوسٹ آفس کے سامنے سے گزرتے ہوئے فریر روڈ۔ جہاں مشتبہ قسم کے ہوٹل، پنجابی نانبائیوں کی دکانیں اور شرابی ملاح پائے جاتے ہیں! یہ وہ علاقہ ہے جہاں بندرگاہ میں آئے ہوئے جہازوں کا انسانی کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

"تم اس سڑک پر رہتی ہو؟"

"سڑک پر نہیں اس اگلی گلی میں!"

اور کسی نے جیسے کندن کے "کاشانۂ عشرت" کو متزلزل کر ڈالا ہو۔ گلی میں صرف ایک زرد روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ اندھیری اونچی عمارتیں شرابیوں کی طرح ایک دوسرے پر گری پڑ رہی تھیں۔ مچھلی، تیل، دال کے بگھار، بیر، تاڑی، فنائل اور نہ جانے کتنی غیر معلوم اور مکروہ چیزوں کی ملی جلی بساند جو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں کتنے ہی چوہے چھچھوندروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ایک کالی بلی اپنی سبز آنکھیں چمکاتی ہوئی ان کے سامنے سے گزر گئی۔ ایک مریل خارش زدہ کتے میں الجھ کر کندن تقریباً گر پڑا۔

تو یہاں رہتی تھی اندرا! کندن کے رومانی خوابوں کی تعبیر کتنی خوفناک نکلی۔

ایک مکان کے سامنے ٹھہر کر اندرا نے کہا "یہاں رہتے ہیں ہم۔

تیسرے مالے پر۔"

کندن نے جان چھڑانے کے لئے کہا" اچھا تو میں چلا۔ نمستے"۔

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ اتنی دور تکلیف کر کے آئے ہیں میری ماتا جی کیا کہیں گی کہ ایک پیالی چائے کو بھی نہیں پوچھا"۔

زینے پر گھپ اندھیرا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہر منزل پر گیلری میں لوگ سوئے ہوئے۔ اندرا کو اس زینے پر چڑھنے کی عادت تھی، وہ کٹہرے کے سہارے چڑھتی چلی گئی۔ مگر کندن کو بڑی مشکل پڑی۔ لکڑی کی سیڑھیاں برسوں کے استعمال سے گھس چکی تھیں۔ ایک جگہ پاؤں اُدھڑا اور وہ گرتے گرتے بچا۔

"لائیے اپنا ہاتھ، نہیں تو آپ گر پڑیں گے"

اور کندن کو محسوس ہوا کہ اندھیرے، بوسیدہ، غلیظ مکان میں بھی دو ہاتھوں کے ملنے سے ایک نرم رو بدن میں کوندجاتی ہے۔ کتنا نرم اور معصوم تھا وہ ہاتھ۔ کتنا بھروسہ تھا اس میں۔ دوستی، رفاقت، پیار... مگر وہ "کاشانۂ عشرت" والا پیار نہیں!۔

جلد ہی وہ تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ اندرا نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی "آ گئی اندو؟" اور دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں ایک مریل بلب کی روشنی دھوئیں کی وجہ سے اور بھی مدھم ہو گئی تھی۔ یہ کمرہ ہی سارا گھر تھا۔ ایک کونے میں بچھونوں کا ڈھیر تھا، دوسرے میں چولھا تھا جہاں سے دھواں اٹھ کر سارے کمرے میں پھیل رہا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی۔ ایک ٹین کا صندوق

الگنی پر دو بوسیدہ ساڑھیاں دھو کر سوکھنے کے لئے لٹکائی ہوئی تھیں۔ یہ تھا اندرا کا "کاشانۂ عشرت"، جہاں وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔

"کندن جی! یہ ہیں میری ماتا جی ۔۔ اور ماں! یہ ہیں کندن بابو۔ بس سارے اسٹوڈیو میں یہی ایک شریف آدمی۔ بڑی کرپا کر کے مجھے یہاں تک چھوڑنے آئے ہیں"

"نمستے"

"جیتے رہو بیٹا"،

دہلی یا آگرے کی آواز! کندن نے غور سے اندرا کی ماں کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر اس کی تمام زندگی کی کہانی جلی حروف میں لکھی ہوئی تھی۔ غربت۔ محنت۔ مشقت۔ دکھ۔ بیماری۔ دھوئیں سے بھری ہوئی کوٹھری ایک ظالم، شرابی شوہر۔ جوان بیٹی کی شادی نہ کر سکنے کا غم۔ فاقے۔ ان جھریوں میں کیا کچھ نہیں لکھا تھا۔ اس کا چہرہ ایک کھنڈر کی مانند تھا ۔۔ گری ہوئی چھت، ٹوٹی ہوئی دیواریں، ملبے کا ڈھیر۔ پھر بھی کندن کو اس میں ایک جانی بوجھی جھلک نظر آئی۔ آنکھوں میں وہی معصومیت، وہی بھولاپن، وہی متانت جو اندرا کی آنکھوں میں تھی۔ اور جسے عمر بھر کی مصیبتیں اور مشقتیں بھی فنا نہ کر سکی تھیں۔

اندرا کا باپ گھر پر نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر کندن نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ دادا گنی کی باتیں سن کر اس کے بارے میں کچھ اچھا خیال نہ قائم ہوا تھا۔

ایک کونے میں چند خالی بوتلیں لڑھک رہی تھیں اور تاڑی کی کھٹی بو آ رہی تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کیوں اپنی بیٹی کو تین روپے پیشگی کے عوض دادا گنجا کے ہاتھ ” بیچ آیا تھا۔

اندرا نے بغیر پوچھے چائے کا پانی چڑھا دیا تھا۔ اس کی ماں نے کسی قدر ہچکچاہٹ سے کہا ” گڑ کی چائے پینا تو آپ کیا پسند کریں گے “

کندن جو اس گھرانے کی بابت سوچ رہا تھا چونک پڑا ” جی۔ کیا کہا گڑ کی چائے؟ ہاں ہاں کیوں نہ پیونگا۔ بازار ہی میں کون سی اصلی شکر کی چائے ملتی ہے۔ اور پھر پاؤڈر کا دودھ۔ دور سے بو آتی ہے “

راشن کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ پھر اندرا کی ماں نے اپنے وطن میرٹھ کا ذکر شروع کر دیا۔ بے تکلفی سے۔ جیسے کسی گھر والے سے بات کرتے ہیں۔ وہ لوگ ذات کے کائستھ تھے۔ کندن نے نہ جانے کیوں زور دے کر کہا ” میں بھی کائستھ ہی ہوں “) اندرا کا باپ چھاؤنی میں دکان کرتا تھا وہاں فوجیوں کی دیکھا دیکھی شراب کی لت لگ گئی۔ ساری پونجی بوتلوں کی نذر ہو گئی۔ جنگ کے زمانے میں ایک جہاز پر نوکری کر لی۔ وہاں شراب کی عادت اور بھی پکی ہو گئی۔ کام رسد خریدنے کا تھا۔ سرکاری مال کی چوری کے جرم میں نکالا گیا۔ اب چھ مہینے سے بے کار تھا۔

اور کندن نے سوچا۔ ان چھ مہینوں میں اندرا کی ماں کے چہرے پر کتنی جھریاں پڑی ہوں گی۔ گھر کی کون کون سی چیزیں بکی ہوں گی کہ نوبت بیٹی تک آ گئی تھی۔

چائے تیار کر کے اندرا کندن کے لئے بے پرچ کی پیالی میں لائی۔ خود اس نے ایک کنڈا ٹوٹی پیالی میں پی اور ماں کو کٹورے میں دی۔ چائے اچھی تھی۔ گرم اور میٹھی۔ پی کر کندن اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا اب میں جاتا ہوں"

"جیتے رہو بیٹا! تم سے مل کر بڑا اطمینان ہو گیا۔ ذرا اندرا کا خیال رکھنا۔ زمانہ برا ہے"۔ کاش کندن اسے بتا سکتا کہ زمانہ کتنا برا تھا! اسے یہ خیال کر کے شرم آ گئی کہ وہ خود جسے اتنا شریف سمجھا جا رہا تھا کس قسم کے ارادوں اور امیدوں سے یہاں آیا تھا۔

"ٹھہریئے میں آپ کو روشنی دکھاتی ہوں۔ نہیں تو آپ پھر گر پڑیں گے" یہ کہہ کر اندرا نے ایک ٹین کا چراغ جلایا اور لے کر باہر آ گئی۔

"نمستے ماتا جی!" نہ جانے اس کی زبان سے یہ الفاظ کیسے نکلے تھے۔ اس کے دل کی کسی تہہ میں اسے اپنی ماں یاد آ گئی تھی جسے وہ کرنال میں چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔

چراغ کی روشنی میں زینے پر اترتے ہوئے اس نے اندرا سے کہا "چائے کا شکریہ"

"شرمندہ کرتے ہیں آپ؟"

کندن نے نیچے سے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ چراغ ہاتھ میں لئے اندرا ٹھہرے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ جھلملاتی ہوئی لو کی ہلکی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی جو اس وقت پہلے سے بھی زیادہ دلکش اور معصوم نظر آتا تھا۔

اور اس کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی جس میں وعدہ، شکریہ، رحم، دوستی، دل لگی اور دکھ سب کچھ تھا۔

کندن ایک لمحے کے لئے مبہوت ہوگیا۔ اور اس کے فلم زدہ دماغ نے سوچا۔ کاش میری آنکھیں کیمرے کا لینز ہوتیں اور میں اس خوبصورت منظر کو ہمیشہ کے لئے قلم بند کر سکتا۔

جوں جوں وہ زینہ اترتا گیا، اندرا کے چراغ کی روشنی کم ہوتی گئی۔ مگر نیچے اتر کر جب اس نے زینے کے اندھیرے کنوئیں کی تہہ سے اوپر کی طرف دیکھا تو اسے چاروں طرف پھیلی ہوئی سیاہی میں ایک ننھی سی لو چمکتی ہوئی نظر آئی۔ بہت دور۔ بہت اونچائی پر!

وہ گیلری میں راستہ ٹٹول کر باہر جا رہا تھا کہ تاڑی کی بدبو کے بھپکے کے ساتھ ایک شخص لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا۔ باہر سڑک کی پیلی روشنی کے خلاف دروازے میں کھڑا ہوا وہ ایک سیاہ اور عجیب دو ٹانگ کا جانور معلوم ہوتا تھا۔

"اندرا کا باپ" اس نے سوچا اور بچنے کے لئے دیوار کے سائے میں دبک گیا۔ شرابی لڑکھڑاتا، گالیاں بکتا، ٹھوکر کھاتا زینے پر چڑھتا گیا۔ اور کندن دروازے کی طرف بھاگا۔

باہر گلی میں کھڑے ہو کر ایک بار پھر اس نے اندرا کے مکان پر نظر ڈالی۔ اندھیرا۔ ڈراونا۔ مہیب۔ مگر اس میں کتنی ہی ننھی ننھی کھڑکیاں چمک رہی تھیں۔ اور کندن نے سوچا کہ ان میں سے ایک ننھی سی روشنی

اندرا ہے۔ اندر اب اسے وہ گلی اتنی متعفن اور غلیظ نہ معلوم ہوئی جتنی آدھ گھنٹہ پہلے تھی۔

سیٹی بجاتا ہوا وہ بوری بندر کی طرف چلا۔ یہاں تک کہ اندھیرے میں فیڈ آؤٹ ہوگیا۔

## اِنٹرول

(پان، بیڑی، چائے، لیمن، سوڈا، رس بھری، مونگ پھلی، کھارا پستہ، آئس کریم ... ... )

# ساتواں ریل

(جس میں ہیرو ہیروئن کی خاطر اپنا فیصلہ تبدیل کرتا ہے)

نرمل غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

"دیکھیے، باسو صاحب۔ اگر آپ کو میری کہانی پسند نہیں ہے تو پھر آپ نے خریدی ہی کیوں؟ اتنی تبدیلیاں کرنے سے تو بہتر ہوگا کہ آپ میری کہانی واپس کر دیں اور خود لکھ لیں۔ آخر مجھے پانچ ہزار کس لئے دے رہے ہیں"۔

ڈائرکٹر باسو نے نہایت ملائمت سے سمجھایا: "پانچ ہزار روپے دے رہے ہیں آپ کے نام کے۔ ساہتیہ میں آپ نے اتنا نام بنایا ہے تو کس لئے۔

پھر آپ کی کہانی کا نام۔ سُرکھ سبیرا۔ اچھا نام ہے۔ ذرا revolutionary colour ہے اس میں۔ آج کل ایسے نام اچھے چلتے ہیں۔ اور آپ کی کہانی میں کئی incidents بھی اچھے ہیں۔ ہیرو کا کیریکٹر بھی ہم نے وہی رکھا ہے۔ آپ نے مل مزدور دکھایا تھا ہم نے ریڈیو سنگر بنا دیا ہے۔ گانا بھی تو ہونا۔ اور گانا ایک دم revolutionary لگائیے گا۔ سارے دیش میں آگ لگا دے گا"

کندن یہ سب گفت گو باہر برآمدے میں کھڑا سن رہا تھا۔ نرمل سے زیادہ اُسے غصہ آرہا تھا۔ آخر ان ڈائرکٹروں کو یہ کیا مرض تھا کہ اچھی خاصی کہانی کا ستیاناس کرنے پر تلے رہتے تھے۔ نرمل ہندستان کا اتنا مشہور لیکھک تھا۔ کندن نے کہیں پڑھا تھا کہ اس کی کہانیاں نہ صرف انگریزی میں ترجمہ ہو کر انگلستان اور امریکہ کے مشہور رسالوں میں شائع ہوئی تھیں بلکہ فرینچ اور جرمن میں بھی چھپی تھیں۔ ایسے لیکھک کی کہانی میں ڈائرکٹر یا سو جیسا جاہل ردّ و بدل کرے یہ کہاں کا انصاف تھا۔ مگر آئے دن اسٹوڈیو میں یہی ہوتا رہتا تھا۔ ایک ڈائرکٹر نے منشی پریم چند جی کے ایک مشہور ناول کو کند چھری سے قتل کیا تھا، ایک اور نے کرشن چندر کی کہانی میں صرف اتنی تبدیلی کی تھی کہ ہیرو کو ایک کشمیری کسان کے بجائے راجپوتانہ کا ایک نوجوان زمیندار بنا دیا گیا تھا اور ہیروئن کو ہانو کی بیٹی کے بجائے شاہی محل کے مالی کی بیٹی — جو آخری ریل میں ایک زمیندار کی لڑکی ہی ثابت ہوتی ہے (پیدا ہوتے ہی لڑکی محل سے ہٹالی گئی تھی اور اس کے بدلے میں مالی کا بیٹا وہاں رکھ دیا گیا تھا،

... مگر کندن کو یقین تھا کہ نرمل جیسا انقلابی مصنف باسو کی ایک نہ سنے گا بلکہ ایسی کھری کھری سنائے گا کہ ڈائرکٹر صاحب بھی یاد کریں گے۔ کیا نرمل نے اپنے افسانوں کے مجموعے "خون اور پسینہ" کے مقدمے میں نہیں لکھا تھا کہ "دنیا کی ہر نعمت خریدی جا سکتی ہے، دولت، عزت، مکان، لباس بہترین غذا، یہاں تک کہ عورت کا جسم بھی خریدا جا سکتا ہے۔ ووٹ خریدے جا سکتے ہیں۔ سیاست داں اور لیڈر خریدے جا سکتے ہیں۔ مگر فن کار کا قلم نہیں خریدا جا سکتا۔"

کندن نے دروازے کی طرف کان لگا دیئے اس انتظار میں کہ کب نرمل اپنی زبان کی ایک جنبش سے ڈائرکٹر باسو کے تمام دلائل کو چکنا چور کرتا ہے۔

باسو کہہ رہا تھا "دیکھئے نرمل جی، یہ فلم اسٹوڈیو ہے۔ یہاں بڑے بڑے لیکھکوں کی کہانیاں بدل دی جاتی ہیں۔ ساہتیہ اور چیز ہے سینما اور۔ ہمیں باکس آفس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ سیٹھ جی کے تین لاکھ روپے اس پکچر پہ لگنے والے ہیں۔ اگر اس میں ہم نے دس بارہ گانوں کی سچویشنز نہ رکھیں تو کوئی ڈسٹری بیوٹر ہاتھ بھی نہ لگائے گا۔"

کندن نے سوچا۔ اب نرمل کہے گا "بھاڑ میں جائیں آپ، آپ کے سیٹھ جی اور آپ کا باکس آفس۔ میں اپنی کہانی کو بدلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

مگر نرمل خاموش رہا۔ اور باسو کا پارہ اوپر چڑھتا رہا۔ اور اس کی

آواز بھی۔

"اگر آپ کہانی بدلنا نہیں چاہتے تو آپ کو ہزار روپے جو اڈوانس دئے گئے ہیں وہ واپس کر دیجئے اور کنٹرا کٹ پھاڑ ڈالئے۔ ہم منشی پردیسی سے دوسری کہانی لکھوا لیتے ہیں"

"یہ لیجئے اپنے روپے۔ میں اپنے فلم کو کسی قیمت پر نہیں بیچ سکتا" مگر یہ الفاظ نرمل کی زبان سے نہیں نکلے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے مری ہوئی سی آواز میں کہا "نہیں، باسو صاحب۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ فلموں کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ یہ تبدیلیاں ضروری ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں ڈائلاگ دوسرے لکھ لاؤں گا۔ رات بھر کی مہلت دیجئے تاکہ میں اسی نئی لائن پر غور کر سکوں"

کاغذات جمع کرنے اور چمڑے کے تھیلے میں ٹھونسنے کی آواز آئی۔ اور ڈائرکٹر باسو کی آواز۔ ملائم مگر زہریلے طنز سے بھری ہوئی "ہم تو آپ ایسے نیکھکوں کی مدد کرنا چاہتا ہے، نرمل جی۔ نہیں تو کہانی ڈائلاگ تو دو ہزار میں دس رائٹر لکھنے کو تیار ہیں"

"نمستے، باسو صاحب" "کل حاضر ہوں گا"

"نمستے"

کندن، نرمل کے باہر نکل آنے سے پہلے ہی کھسک آیا۔ اس کے دماغی مندر کا ایک بت اور آج ٹوٹ گیا تھا، نرمل — انقلابی، باغی نرمل — نے ہزار روپے کی خاطر وہ فلم بیچ دیا تھا جو آج تک کبھی نہ بکا تھا

جب نرمل برآمدے میں باہر نکلا تو کندن نے ایک نظر میں دیکھ کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اُس نے کندن سے بات نہیں کی بلکہ جلدی سے منہ پھیر کر سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا اسٹوڈیو سے باہر چلا گیا۔

کندن کو اس اخلاقی شکست پر زیادہ دیر غور کرنے کی مہلت نہ ملی ڈائرکٹر ہنڈا کے دونوں اسسٹنٹ چوپڑا اور رام ہوٹل کی طرف سے باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے۔ کندن کو دیکھ کر انھوں نے اُسے اشارے سے اپنی طرف بلایا اور املی کے درخت کے نیچے والے چبوترے پر بیٹھ گئے۔

"نمستے رام جی نمستے چوپڑا جی۔ کیا حکم ہے؟"

"کندن۔ آج شام کو یونین کی میٹنگ ہے۔ تمھیں بھی چلنا چاہئے"

"یونین؟ کیسی یونین؟"

"فلم ورکرز یونین۔ ہم سب اُس کے ممبر ہیں تمھیں بھی ممبر بننا چاہئے،" چوپڑہ نے کہا

"پر چوپڑہ جی یونین تو مزدوروں کی ہوتی ہے"

"تو کیا ہم اسٹوڈیو میں کام کرنے والے مزدور نہیں ہیں،" رام نے جواب دیا۔ "کیا سیٹھ اور سرمایہ دار ہم کو بھوکا نہیں مارتے؟ مجھے پانچ برس ہو گئے ہیں اسسٹنٹی کرتے ستّر روپے تنخواہ ملتی ہے۔ تمھاری کیا تنخواہ ہے؟"

"تیس روپے ماہوار" کندن نے جھجکتے ہوئے اقرار کیا۔

"اور جانتے ہوٹل کے مزدور کو کیا ملتا ہے؟ ساٹھ ستر روپے ماہوار" رام نے کہا اور چوپڑہ نے لقمہ دیا "تم سے کہیں زیادہ تو میونسپلٹی کے بھنگیوں کو تنخواہ ملتی ہے"

کندن کو ہرگز یہ اچھا نہیں لگا کہ اس کا مقابلہ بھنگیوں اور کارخانے کے مزدوروں سے کیا جائے، مگر رام نے اسے بولنے کا موقعہ ہی نہیں دیا "اور جانتے ہو کیوں مل کے مزدور اور بھنگی ہم سے بہتر حالت میں ہیں؟ اس لئے کہ ان کی اپنی اپنی یونین ہے جو مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے"

ٹالنے کی خاطر کندن نے وعدہ کر لیا کہ وہ جلسے میں آجائے گا مگر اس کا ارادہ ہرگز نہیں تھا۔ کون یونین ونین کے جھگڑوں میں پڑے! آج اُسے تنخواہ ملی تھی۔ اور اس کا ارادہ تھا کہ کوئی فلم دیکھے گا۔ پروڈکشن مینیجر کے کمرے سے سروپ کو نکلتے دیکھا تو سوچا اسے بھی ساتھ لے جائے۔

"چلو سروپ کیا یاد کرو گے کسی رئیس سے پالا پڑا تھا تمھیں آج سینما دکھلائیں"۔ مگر سروپ نے اُس کی دعوت کو منظور نہیں کیا "تم جاؤ میں تو میٹنگ میں جا رہا ہوں"

"تمھاری مرضی!" اور پھر میٹنگ کے ذکر سے کھٹک کر "کیسی میٹنگ ہے؟"

"یونین کی میٹنگ"

"تم بھی یونین میں ہو؟"

"ہاں اور کیا؟"

"اور مرنا؟"

"وہ بھی آج ہی ممبر بنا ہے۔ تم بھی کیوں نہیں چلتے"

نہ جانے کیوں کندن کو اس یونین سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ جس کو دیکھو یونین ہی کا ذکر۔ اس کے علاوہ اس نے دور سے اندرا کو آتے دیکھا تو سوچا "آج ہم ضرور اکٹھے سینما جائیں گے۔ چاہے ڈھائی ڈھائی روپے کے ٹکٹ ہی کیوں نہ خریدنے پڑیں۔ سو اس نے سروپ کو بھی ٹال دیا" اچھا تم چلو۔ موقعہ لگے گا تو میں بھی آؤں گا"

سروپ جلدی میں تھا اس نے اپنا راستہ لیا اور کندن اندرا کی طرف مخاطب ہوا۔ وہ حسب معمول سوتی دھلی ساڑھی میں ملبوس تھی مگر نہ جانے کیوں کندن کو وہ اور دنوں سے زیادہ خوبصورت نظر آئی۔

"میں نے کہا جی نمستے" اس نے تپاک سے کہا۔

"نمستے کندن جی" اندرا نے اپنے نازک ہاتھوں کو جوڑتے ہوئے جواب دیا۔ اور ان ہاتھوں کو دیکھ کر کندن کو اس رات کا زینے پر چڑھنا یاد آگیا جب چند لمحوں کے لئے ان کے ہاتھوں نے ایک دوسرے کو چھوا تھا۔

"آج ہم ضرور سینما جائیں گے" بجائے دعوت دینے کے اس نے فیصلہ ہی سنا دیا۔

"مجھے تو معاف کیجئے۔ میں آج نہ جا سکوں گی"

"کیوں کیا کوئی خاص کام ہے؟"

"آج سنا ہے یونین کی میٹنگ ہونے والی ہے۔ آپ نہیں جا رہے ہیں"

"اوہ — یونین کی میٹنگ! — آپ نے خوب یاد دلایا ... ہاں ہاں کیوں نہیں جا رہا ہوں۔ آیئے اکٹھے ہی چلیں"

"چلئے"

راستے میں اُس نے پوچھا "آپ کئی دن سے نظر نہیں آئیں کہاں رہیں"

"میں رنیچ گئی تھی"

"رنیچ گئی؟" — وہ توریئسوں کی تفریح گاہ تھی یا بیماروں کا سینی ٹوریم ایک غریب اکسٹرا لڑکی کا وہاں کیسے گزر ہوا؟

اندرا نے جیسے اس کے خیالات اور شبہات کو پڑھ لیا ہو "میری ایک سہیلی وہاں تپ دق کے سینی ٹوریم میں ہے۔ اُس نے بلایا تھا۔ دس برس بعد ملی۔ ہم دونوں میرٹھ میں ساتھ پڑھتے تھے پرائمری اسکول میں"

"اکیلی رہتی ہے آپ کی سہیلی وہاں؟"

"ہاں — مگر نرمل صاحب کبھی کبھی جاتے ہیں"

"نرمل صاحب؟"

"ہاں مشہور لیکھک — نرمل۔ کملا ان کی بیوی ہے۔ بہت چاہتے

ہیں اُسے۔ ڈاکٹروں نے تقریباً جواب دے دیا ہے۔ مگر وہ اس کے علاج کے لئے کتنی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ بنگلہ لے کر رکھا ہے۔ نرس رکھی ہے۔ کم سے کم ہزار روپے مہینے کا خرچ ہے ... کیوں آپ چپ کیوں ہو گئے۔ کیا آپ نرمل جی کو جانتے ہیں؟"

"نہیں"۔ اس نے سچ کہا۔ کیونکہ وہ صرف لیکھک نرمل سے اور اس کی لکھائی سے واقف تھا۔ آج اُسے معلوم ہوا کہ آزاد قلم کیوں بازار میں بکتے ہیں — اور کس بھاؤ!

"نہیں۔ میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا"۔

# آٹھواں ریل

(جس میں ہیروئن بجائے مغموم غزل گانے کے ایک انقلابی نعرہ بلند کرتی ہے)

فلم ورکرز یونین کا جلسہ بجائے چھ بجے کے پونے سات بجے شروع ہوا۔ حاضرین کی تعداد تقریباً چھ سو کے قریب تھی۔ کندن کو اُمید تھی کہ شاید جلسے کے بہانے بڑے اور مشہور فلمی "ستاروں" کے درشن ہو جائیں گے مگر اُسے مایوسی ہوئی جب اُس نے سوائے کھدر پوش پرتھوی راج کے ایک بھی نام والے ایکٹر یا ایکٹرس کو وہاں نہ پایا۔ مگر چھوٹے درجے کے

ایکٹر، ایکسٹرا مرد اور عورتیں، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ کیمرہ مین لائٹ قلی وغیرہ کافی تعداد میں موجود تھے۔

کندن کے لئے کسی یونین کے جلسے میں شرکت کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا اور دراصل وہ آیا بھی تھا اندرا کی خاطر نہ کہ فلمی مزدوروں کے اقتصادی تحفظ کی خاطر۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید اندرا کو بھی اس جلسے میں صرف تفریحی دلچسپی ہوگی۔ مگر جس انہماک سے وہ ہر تقریر کو سن رہی تھی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ ایسے جلسوں میں وہ پہلے بھی شریک ہوئی ہے۔ شراب میں اپنے آپ کو ڈبونے سے پہلے میرے پتاجی بھی سی مینرز یونین کے ممبر تھے۔ ان کے ساتھ میں بھی یونین کے جلسوں میں جایا کرتی تھی۔ اس نے فخریہ لہجے میں کندن کو بتایا۔ اور کندن کو یہ سوچ کر کافی شرم محسوس ہوئی کہ فلمی فنکار اور اداکار بھی اب ملاحوں اور خلاصوں کے درجے پر آ گئے ہیں۔

تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا تو ختم ہونے میں نہ آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر گمنام ایکٹر، ہر ایکسٹرا، ہر اسٹوڈیو قلی اپنی زباندانی کی دھاک بٹھانے پر تلا ہوا ہے۔ مگر سوائے پرتھوی راج کے کسی ایک کو بھی تقریر کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ کوئی گھبراہٹ کے مارے ہکلا رہا تھا، کوئی اٹک اٹک کر کاغذ پر لکھی ہوئی تقریر پڑھ رہا تھا، کوئی مالکوں کے خلاف الزامات لگاتے وقت مڑ مڑ کر ادھر ادھر دیکھتا جاتا تھا کہ شاید سیٹھ کا کوئی جاسوس چھپا بیٹھا ہو۔ کندن کو پہلے ان تقریروں کو سن کر ہنسی آئی، پھر غصہ آیا۔ مگر کچھ عرصے بعد آہستہ آہستہ فلمی اقتصادیات کے موٹے موٹے نکتے اس کے دماغ میں اترتے

چلے گئے۔

مالک اور سیٹھ بعض فلموں پر پچاس فی صدی سے لے کر تین سو فی صدی تک منافع کماتے ہیں۔ لیکن جن کام کرنے والوں کے گاڑھے پسینے سے یہ منافع حاصل ہوتا ہے ان کو اس میں سے ایک پائی بھی نہیں ملتی۔

کالج کے پڑھے اور تجربہ کار ٹکنیشینز Technicians ( مثلاً کیمرہ مین، ساؤنڈر کارڈسٹ اور لیبارٹری والوں کو اتنی کم تنخواہ ملتی ہے کہ اس سے زیادہ تو اوسط درجے کی اکسٹرا لڑکیاں مہینے میں آٹھ دس دن کام کر کے کما لیتی ہیں۔

کسی اسٹوڈیو میں بھی ملازموں کو وہ حقوق اور رعایات حاصل نہیں ہیں جو ہر کارخانے کے مزدوروں کو ملی ہوئی ہیں۔ نہ پنشن، نہ پراویڈنٹ فنڈ، نہ انشورنس، نہ بندھی ہوئی ترقی، نہ قاعدہ نہ قانون۔ جب سیٹھ جی کی مرضی ہو کان پکڑ کر نکال دیں۔ نہ داد نہ فریاد۔

چھوٹے درجے کے اسٹاف سے ایک دن میں بارہ بارہ پندرہ پندرہ گھنٹے تک بلا اوور ٹائم دیئے کام کرایا جاتا ہے۔ اور کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ دبی زبان سے شکایت کرو تو پروڈکشن منیجر اور مالک کے دوسرے گرگے صاف کہہ دیتے ہیں "اگر ان شرائط پر کام نہیں کرنا ہے تو کوئی اور کام ڈھونڈ لو"

بجلی کا کام کرنے والے قلیوں کو اپنی جان ہتھیلی پر لے کر کام کرنا

پڑتا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے کوئی نہ کوئی حادثہ ہوتا رہتا ہے۔ ہر سال دو ایک مر بھی جاتے ہیں، پھر بھی ان کے پسماندہ خاندانوں کے لئے مالی مدد کا کوئی انتظام نہیں تھا (کندن کو اپنا "بتی جلاؤ۔ بتی بجھاؤ" والا کام اور اس کے خطرات یاد آگئے)

مگر کندن کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب مرزا نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر ایکسٹراز کی طرف سے ایک زبردار تقریر کی اور دادا گنجا جیسے ایکسٹرا سپلائرز کا پول کھول دیا کہ کس طرح ایکسٹراز کی آمدنی کا بیشتر حصہ ہر حالت میں ان کی جیب ہی میں پہنچتا ہے۔ خود ایک ایکسٹرا کی یہ ہمت کہ وہ بھرے جلسے میں دادا گنجا اور اس کی برادری پر حملہ کرے! اور تو اور دبلے پتلے سروپ نے بھی جوش میں آ کر اسی سلسلے میں ایک تقریر کر ڈالی جو کسی نے سنی اور اکثر نے نہیں سنی۔ کیونکہ اس وقت حاضرین میں سے تقریباً ہر ایک تقریر کرنے کے لئے تیار تھا۔ اور بہت سے بغیر اسٹیج پر آئے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے تقریر کر بھی رہے تھے!

کندن نے اسٹوڈیو میں کام کرنے والوں کو اس انقلابی روپ میں نہیں دیکھا تھا۔ وہی تقریریں جن کو سن کر وہ شروع میں ہنس رہا تھا آہستہ آہستہ اس کے دل و دماغ میں ایک نشہ، ایک جنون، کی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ اُس کے نوجوان دل کی دھڑکن پکار پکار کر اُس سے کہہ رہی تھی! "کیا تجھ میں احساس خودداری بالکل نہیں ہے؟ کیا تو ہمیشہ مالکوں کی ٹھوکریں کھانے پر قانع رہے گا؟ کیا تو انصاف اور اپنی جماعت کے اقتصادی مفاد

کی خاطر اپنی آواز نہیں اٹھائے گا؟"

"آپ بھی کیوں نہیں بولتے؟"

جوں جوں جلسے کی کارروائی میں اس کی دلچسپی بڑھتی گئی تھی وہ برابر میں بیٹھی ہوئی اندرا کو بھول ہی گیا تھا۔ شور اور ہڑبونگ میں اس کی سریلی ہلکی آواز ایسی معلوم ہوئی، جیسے کسی زوردار اور شور مچاتے ہوئے آرکسٹرا میں دفعتاً ایک بانسری کی لے شروع ہو جائے ـــــ مگر موجودہ بھی آرکسٹرا کی دھن سے ہم آہنگ!۔

"آپ بھی کیوں نہیں بولتے؟"

ان الفاظ میں اشارہ تھا، دعوت تھی، درخواست تھی، حکم تھا۔ اس کے علاوہ خود کندن کے اپنے دل کی آواز بازگشت بھی تھی۔

اگلے مقرر نے جیسے ہی اپنی تقریر ختم کی کندن لپک کر اسٹیج پر چڑھ گیا۔ مرزا، سردیپ اور اس کے اسٹوڈیو کے چند آدمیوں نے اُسے پہچان کر تالیاں بجائیں۔ اور صدر نے اُس کا نام پوچھ کر اعلان کر دیا کہ "اب مسٹر کندن کمار اسٹوڈیو میں کام کرنے والوں کی حالت کے بارے میں کچھ کہیں گے"۔

کہیں گے! کیا کہیں گے؟ چند لمحوں کے لئے کندن جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ سب بھول گیا۔ ہال میں اس کی نظروں کے سامنے کئی سو چہروں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایک لامتناہی، بے معنی سمندر۔ سانسوں کی لہریں۔ سگریٹ کے دھوئیں کے بادل۔ اور ان بادلوں میں ایک چہرہ پہلے سے

خوبصورت سے چاند کی طرح چمکتا ہوا — اندرا کا چہرہ! اور نہ جانے کیسے اس مجمع میں اندرا کو دیکھتے ہی اس کی گھبراہٹ دور ہو گئی جیسے طوفانی سمندر کو ایک دم سکون آ جائے۔ اور اُسے یاد آ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔

اس نے اوروں کی طرح دھواں دھار تقریر نہیں کی۔ انقلابی جملے نہیں دہرائے۔ نہ جذبات کو ابھارا اور نہ دھمکیاں دیں۔ دھیمی آواز اور دوستانہ بات چیت کے انداز میں اس نے بولنا شروع کیا۔ اور جوں جوں وہ بولتا گیا سننے والوں نے اپنے آپ کو ایک اسٹوڈیو میں پایا جہاں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ نظر کو خیرہ کرنے والی سیکڑوں روشنیاں جگمگا رہی تھیں "لائٹس آن۔ لائٹس آف۔ بتی جلاؤ۔ بتی بجھاؤ" کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی اندھیرا۔ کبھی اُجالا۔ اور چالیس پچاس فٹ اونچائی پر اسٹوڈیو کی چھت میں لگے ہوئے گاڈروں اور کھانچوں سے کتنے ہی "لائٹ قلی" چمگادڑوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ "لائٹس آن۔ لائٹس آف" اندھیرے اُجالے کا یہ سارا کھیل اُن کے دم سے ہے۔ دن یا رات کے دس دس بارہ بارہ گھنٹے وہ اسی طرح چھت میں لٹکے رہتے ہیں۔ اُن کو چائے پانی بھی رسیوں کے جھولے کے ذریعے وہیں اوپر پہنچایا جاتا ہے۔ ہر لمحے اُن کی جان خطرے میں رہتی ہے۔ اگر کوئی رسی ٹوٹ جائے! اگر کوئی قدم تختہ پر پھسل جائے اگر تکان اور نیند سے چور ہو کر کوئی بے چارہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی اونگھ جائے! اگر کسی بوسیدہ بجلی کے تار کو ہاتھ لگ کر خوفناک برقی رو بدن میں دوڑ جائے! اگر کوئی من بھر وزنی لائٹ سر پر گر پڑے! ہر سال دو چار ایسے

"حادثے،، تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اور اس پر بھی ان لائٹ قلیوں کو اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کا صلہ پچیس نہیں روپے ماہوار ملتا ہے۔" اگر کل میں اپنی ڈیوٹی کے وقت اوپر سے گر کر مر جاؤں تو یقین ہے کہ میری جیب سے یا میرے سامان کو بیچ کر بھی میرے کریا کرم کے لئے کافی رقم نہ مل سکے گی۔"

ہر شخص چپ چاپ کندن کی تقریر سن رہا تھا۔ گنی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور اندرا اس انداز سے کندن کو دیکھ رہی تھی جس میں فخر بھی تھا اور رحم بھی!

"تو میں پوچھتا ہوں"، کندن کی آواز بالآخر گونجی کہ "کیا ہم ہمیشہ یوں ہی باربرداری کے گدھوں کی طرح یہ ظلم برداشت کرتے رہیں گے؟ کیا ہم متحد ہو کر ان سیٹھوں اور مالکوں کا مقابلہ نہ کریں گے جو ہمارے گوشت پوست ہماری ہڈیوں اور خون سے اپنے رنگ محل بناتے ہیں؟ ... میں کہتا ہوں کہ تقریروں اور تجویزوں کا وقت گزر گیا ہے۔ عمل کی گھڑی آن پہنچی ہے میں چاہتا ہوں کہ آج ہم سب مل کر یہ طے کر لیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ بولئے کہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے؟"

ہال میں خاموشی! خود کندن کو نہیں معلوم تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ اگر حاضرین میں سے کسی نے اُس کے سوال کا جواب نہ دیا تو اس کے لئے مشکل پڑ جائے گی۔

جواب سوچنے کے لئے تھوڑی مہلت پانے کی خاطر کندن اپنے سوالات کو دہراتا رہا "بولئے بولئے۔ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟ کس طرح اپنی

متحدہ مانگوں کو منوانا ہے؟ ... کس ہتھیار سے اس انیائے اور ظلم کا مقابلہ کرنا ہے؟"

اور خاموش، ساکن ہال میں سے ایک مہین سی آواز آئی "اسٹرائک" اندرا کی آواز۔ ایک انقلابی نعرہ۔ طبل جنگ۔

اسٹرائک!

اسٹرائک!!

اسٹرائک!!!

اور فوراً یہ طے ہو گیا کہ ایک اسٹرائک کمیٹی بنالی جائے اور وہ تیاریاں شروع کر دے، اور جو مالکان اپنے اسٹوڈیو کے ملازموں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے اُن کو اسٹرائک کی دھمکی دی جائے۔ اس کمیٹی میں کندن کو بھی رکھ لیا گیا۔ اور اس کے کامیاب اور بلا مقابلہ چناؤ پر خوب تالیاں بجیں۔ مرزا اور سروپ کو بھی اس کمیٹی پر ایکسٹراز کے نمایندوں کی حیثیت سے لے لیا گیا۔

جب کندن اپنی جگہ واپس پہنچا تو اس نے اندرا کی آنکھوں کو خوشی اور جوش سے چمکتا پایا۔ "آپ تو بڑے اچھے اسپیکر نکلے"، اس نے کہا اور کندن کے ہاتھ کو نہایت تپاک اور گرمجوشی سے دبایا۔ اس نرم لمس میں مبارکباد بھی تھی اور محبت کا اقرار بھی۔ وہ "کاشانۂ عشرت" والی جنسی محبت نہیں بلکہ وہ محبت جو دوست کو دوست سے اور ساتھی کو ساتھی سے ہوتی ہے۔

# نواں ریل

(جس میں زہر عشق ٹنکچر آئیوڈین ثابت ہوتا ہے)

تمام اسٹوڈیو میں کھلبلی۔

نازنین واپس آگئی۔ اپنے عاشق کے ساتھ جوہو کے ایک ہوٹل میں پکڑی گئی۔

نازنین واپس آگئی۔ سنا ہے شادی کر لی تھی۔

نازنین واپس آگئی۔ اور بھی کوئی نہیں ملتا تھا۔ ایک فوجی لفٹنٹ کے ساتھ ....   ....

نازنین واپس آگئی۔ اس کی نانی چٹیا پکڑ کر لے آئی۔

نازنین واپس آگئی۔ سنا اُس کی ماں نے بہت مارا۔

نازنین واپس آگئی۔ لفٹننٹ اسحاق نے نازنین کی ماں سے پچیس ہزار روپے لے کر طلاق دے دی۔

نازنین واپس آگئی۔ ماں اور نانی نے اس پر پہرہ لگا رکھا ہے

نازنین واپس آگئی۔ سیٹھ صاحب نے اسے ڈائرکٹر باسو کے فلم "سرخ سویرا" کے لئے منتخب کیا ہے۔

نازنین واپس آگئی! نازنین واپس آگئی!! نازنین واپس آگئی!!!

نازنین آج اسٹوڈیو آرہی ہے۔

کندن دل ہی دل میں نازنین سے خفا تھا۔ اس نے طے کر لیا کہ میں اس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔ جائے اپنے لفٹننٹ کے پاس ۔۔۔ بھری مردانہ آواز والی "کملا" جس نے پچیس ہزار کے عوض اپنی محبت کو، نازنین کو، بیچ ڈالا! ... اس کے علاوہ وہ یونین کی کمیٹی کے دوسرے ممبروں کے ساتھ اسٹرائک کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ مالکوں کی انجمن نے نہایت حقارت سے ان کی مانگوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ گریٹ آرٹ پکچرز کے سیٹھ سونامل چاندی والے کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا تھا "میرے اسٹوڈیو میں کوئی کمیونسٹ، سوشلسٹ مزدوروں کو بھڑکا کر دیکھے۔ سیدھا کر دوں گا سالوں کو۔"

کندن کو ہنسی آئی جب اُس نے اگلے دن ہی یہ اشتہار فلمی ہندستان

کے سرورق پر پڑھا:

سیٹھ سونامل چاندی والے

کی انقلابی پیش کش

# سُرخ سویرا

انصاف اور جمہوریت کی صبح نو

آزادی کا پیغام

مزدوروں اور کسانوں کے لئے نوید جانفزا

خاص اداکار

نازک حسینہ نازنین "تتلی" نیم،

خوبرو دیپ کمار

اور اب اندر ہی اندر اسٹرائک کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں، چندہ جمع کیا جا رہا تھا۔ ممبر بنائے جا رہے تھے۔ وعدے لئے جا رہے تھے جیل جانے اور لاٹھیاں کھانے کے لئے دلوں کو مضبوط بنایا جا رہا تھا۔ کندن ہر ایک سے کہتا تھا "اگر ہم اڑے رہیں اور اپنی یونین سے غداری نہ کریں تو ہمارا اسٹرائک ضرور کامیاب ہو سکتا ہے"

اندرا جس کو اس عرصے میں یہاں وہاں اکسٹرا کا کام ملنے لگا تھا، بھی اس کام میں پورا پورا حصہ لے رہی تھی۔ اکثر وقت جب ان کو اسٹوڈیو کا کام نہ ہوتا تو وہ دونوں ساتھ ہی رہتے تھے۔ یونین کی تنظیم کے سلسلے میں اسٹوڈیو

اسٹوڈیو پھرتے ۔ دادر سے پریل ۔ تاردیو ۔ اندھیری ۔ گورے گاؤں ۔ ملاڈ، اندرا کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سینکڑوں ایکسٹرا لڑکیاں یونین کی ممبر بن گئی تھیں اور جوش و خروش سے اسٹرائک کی تیاریوں میں حصہ لے رہی تھیں بیس بائیس اس کے لئے تیار تھیں کہ جب اسٹرائک شروع ہو تو اسٹوڈیوز کے دروازوں پر لیٹ جائیں گی تاکہ کوئی غدار کام پر نہ جاسکے ۔

کندن نے جو کچھ سنا تھا ، پڑھا تھا ، فلموں میں دیکھا تھا اس کی بنا پر اس کا خیال تھا کہ محبت اس طرح ہوتی ہے ، جیسے بجلی گرتی ہے ۔ اچانک دل پر چوٹ لگتی ہے اور عاشق دل پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے ۔ آنکھیں معشوق کے جلوے سے خیرہ ہو جاتی ہیں ۔ ایک تیر جگر کے آر پار ہو جاتا ہے ۔ اگر محبت ایسی ہوتی ہے تو یہ جذبہ کیا تھا جو اس کے اور اندرا کے درمیان پروان چڑھ رہا تھا؟ اس میں نہ شراب کی تندی تھی اور نہ دنیا کو فراموش کرنے والا نشہ ۔ رفاقت کی چاشنی تھی ۔ دوستی کا مزا تھا ۔ مشترکہ دلچسپیوں اور مشترکہ خیالات کا بندھن تھا ایک ناقابل بیان ہلکی ہلکی سی کسک تھی ۔ کیا محبت اسی کا نام ہے؟

رات کو کبھی کبھی ، کچھ دیر پہلے نیند سے ، یہ سوال کندن کے دماغ میں ابھرتا تھا لیکن دن کی مصروفیات میں وہ اسے بالکل بھول جاتا تھا ۔ کمال یہ تھا کہ اندرا کے ساتھ ہونے پر بھی اس کو محبت نہیں ستاتی تھی ۔ کبھی کبھار وہ سوچتا " آج اندرا کی پیشانی پر بندی کتنی خوشنما لگ رہی ہے " یا " آج اندرا کی باغیانہ زلفیں ہوا میں اڑ کر اس کے بیضوی چہرے کے گرد کتنا خوبصورت ہالہ بنائے ہوئے ہیں " ۔ مگر جلد ہی ان باتوں کو بھول کر وہ اسٹرائک کا ذکر

کرنے لگتے۔ یونین کی سیاست پر بحث ہونے لگتی۔ اور محبت دماغ کے پچھلے کونے میں دبک جاتی۔ مگر پھر بھی وہ بڑھتی رہی، پروان چڑھتی رہی!

جب سے مرزا، سروپ، کندن اور اندرا یونین میں شامل ہوئے تھے دادا گنجا نے ان سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ بلکہ سروپ، کندن یا اندرا کوئی قریب سے گزرتا تو وہ کوئی گندہ فقرہ ان پر کستا "سالے بڑے کمیونسٹ بنتے ہیں"۔ "ساری سوشلزم کے راستے نکل جائیگی"۔ "یہ یونین بھی مرد پھنسانے کا اچھا چکلہ بنایا ہے ان اکسٹرا لونڈیوں نے"۔ مگر مرزا کے سامنے اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ ایسی باتیں کرے۔ کیونکہ مرزا کا قد چھ فٹ دو انچ تھا اور اس کے مگدر جیسے ہاتھوں کا ایک لپّڑ کافی تھا دادا گنجا کو شمشان بھومی پہنچانے کے لئے! مرزا، دادا کے سامنے اکڑتے ہوئے نکلتا اور زور سے کہتا ہے "کون سالا ہے جو یونین کو گالیاں دیتا ہے۔ آئے نہ میدان میں سامنے"۔ اور دادا منہ پھیر کر ان سنی کر دیتا اور خاموش رہتا۔ مگر اب ان سب کو اور خصوصاً مرزا کو فلموں میں کام ملنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ ہر جگہ دادا گنجا نے پروپگنڈا کر رکھا تھا کہ یہ لوگ سوشلسٹ ہیں، کام کرنے والوں کو بھڑکانے کی غرض سے اسٹوڈیو میں کام کرتے آتے ہیں، اس لئے انھیں کام نہ دیا جائے۔

جب نازنین کی پہلی پیکارڈ اسٹوڈیو کے احاطے میں داخل ہوئی تو کندن برآمدے میں کھڑا اندرا کا انتظار کر رہا تھا جو اب تک نہ آئی تھی۔ تقریباً ہر شخص کی نگاہیں نازنین کے استقبال کو اُدھر گھوم گئیں۔ آج وہ ایک

فلم اسٹار ہی نہیں بلکہ زندگی کے ایک اصلی ڈرامے کی ہیروئن بن کر آرہی تھی گھر سے فرار۔ شادی۔ طلاق ۔ ماں اور نانی کی مار۔ لعن طعن ۔ رسوائی ۔ آج وہ ان تمام منزلوں سے گزر کر آرہی تھی ۔ کندن نے دیکھا کہ اس کا چہرہ پیلا پڑگیا ہے، آنکھیں سوجی ہوئی ہیں جیسے روتی رہی ہو اور ان کے گرد کالے حلقے پڑے ہوئے ہیں، جیسے کئی راتوں سے سوئی نہ ہو ۔ موٹر سے گزر کر وہ نیچی نظر کئے سیدھی اپنے ڈریسنگ روم میں چلی گئی اور اس کے پیچھے پیچھے ماں اور نانی کا باڈی گارڈ!

سیٹھ صاحب کی گھنٹی بجی اور کندن اندر گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسٹرائک کے سلسلے میں شاید ڈانٹ پڑے۔ مگر سیٹھ سونامل چاندی والے نے کندن کی طرف اس طرح دیکھا گویا وہ موری کے کیڑے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ۔ "ڈائرکٹر باسو کو یہاں بھیجو ..... اور چنیا بائی اور منی جان کو بلاؤ"۔ کندن سمجھ گیا کہ آج "سرخ سویرا" کے کنٹراکٹ کی بات چیت ہونے والی ہے ۔ ڈائرکٹر باسو کو سیٹھ جی کا پیغام پہنچا کر وہ نازنین کے ڈریسنگ روم پہنچا اور دونوں بوڑھیوں کو یہ مژدہ سنایا کہ سیٹھ جی ان کا انتظار کر رہے ہیں ۔ جسے سن کر خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں ۔ دریائی گھوڑوں کی طرح انھوں نے اپنے موٹے چربی چڑھے ہوئے جسموں کو نہایت مشکل سے گدے دار کرسیوں پر سے اٹھایا اور سیٹھ جی کے دفتر کی طرف روانہ ہوگئیں ۔ نازنین دیوار پر لگے ہوئے آئینے کی طرف منہ کئے ہوئے بیٹھی تھی ۔ نہ جانے کندن کو یہ کیسے محسوس ہوا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے ۔ اس لئے وہ چند قدم جا

کر لوٹ آیا۔

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں"

"ہاں۔ میرے پاؤں میں چوٹ لگ گئی ہے۔ ٹنکچر آئیوڈین چاہئے، ذرا مہربانی کرکے مجھے دفتر سے فرسٹ ایڈ باکس لا دیجئے"

کندن بھاگ کر فرسٹ ایڈ باکس لے آیا۔ نہ جانے کیوں نازنین کا اُداس، پیلا چہرہ دیکھ کر اس کا دل ہمدردی اور رحم سے بھر آیا تھا۔ بیچاری! محبت کی پہلی ہی منزل میں ٹھوکر کھا آئی۔ اُس نے کہا "کہئے تو میں دوا لگا کر پٹی باندھ دوں"

"نہیں میں خود لگا لوں گی۔ آپ یہ بکس یہیں چھوڑ جائیں"۔ اور جب کندن جانے لگا "شکریہ۔ آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گی!"

کتنا فرق تھا اُس چاندی کے روپے کی حقارت بھری جھنکار میں اور اس درد بھری، درد آشنا آواز میں! مگر کندن یہ نہ سمجھ سکا کہ اتنے معمولی سے کام کا اتنا زبردست شکریہ کیوں؟

سیٹھ جی چنیا بائی سے کنٹراکٹ کی شرائط پر بحث کر رہے تھے "ساٹھ ہزار!۔ چنیا بائی ہم سے ایسی باتیں کرتی ہو۔ ابھی "تتلی" میں چالیس ہزار پر کام کر چکی ہو۔ اُس کے بعد یہ سب بدنامی۔ سب پیپرز میں کتنا برا نکلا ہے۔ میں تو سوچتا تھا نہ لوں پھر سوچا اپنی پرانی اسٹار ہے۔ پھر آپ لوگوں سے بھی پرانا سنبندھ ہے۔ "تتلی" والی رقم ہی سہی۔ اس سے زیادہ تو ... "

"اب تو اس سے زیادہ ہی دینا پڑے گا، سیٹھ صاحب۔ جسے آپ

بدنامی کہتے ہیں یہ تو پبلسٹی ہے۔ کیا سمجھے؟ سارے ملک کا کوئی ایسا اخبار نہیں ہے جس میں پچھلے دس دن میں نازنین کا نام نہ چھپا ہو۔"

"مگر بدنامی ..." سیٹھ نے چنیا بائی کے الفاظ کے بہاؤ کو روکنے کی ناکام کوشش کی۔

"بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا؟" منی جان نے لقمہ دیا۔ "پچپن ہزار سے تو ہم ایک کوڑی کم نہ لیں گے۔ کل ہی چندولال شاہ کا ٹیلیفون ..."

"اچھا چلو تمھاری خاطر پچاس کیے دیتا ہوں میں" سیٹھ نے جلدی سے کہا۔

اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے چنیا بائی بولی "خیر تمھارا پکچر ہے سو منظور کیے لیتے ہیں مگر ٹیکس تمھیں ہی بھرنا پڑے گا"

"وہ تو میں ہمیشہ ہی بھرتا ہوں۔ اچھا بلاؤ نازنین کو کنٹراکٹ پر دستخط ہو جائیں"

"ڈریسنگ روم میں ہے۔ کسی کو بھیج دو"

گھنٹی۔ "کندن مس نازنین کو بلاؤ"

کندن ڈریسنگ روم پہنچا تو اندر سے کواڑ بند پائے۔ کھٹ کھٹایا کوئی جواب نہیں۔ پھر کھٹ کھٹایا۔ دھڑ دھڑایا اور کئی آدمی جمع ہو گئے۔

آخر نازنین کو کیا ہوا کہ دروازہ بند کرکے بیٹھ گئی۔

جب پانچ منٹ تک کوئی جواب نہ ملا تو میٹنگ ڈیپارٹمنٹ کے

دو مستریوں نے دروازے پر شانے لگا کر زور سے دھکا دیا۔ پتلی لکڑی کے پٹ کھل گئے۔

اندر نازنین بے ہوش پڑی تھی۔ ہاتھ صوفے پر سے فرش پر آ رہا تھا۔ اور ہاتھ کے قریب ٹنکچر آئیڈین کی شیشی خالی پڑی تھی۔

کندن کے کان میں ایک درد بھری، اور آشنا آواز آئی: "شکریہ آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گی"۔

# دسواں ریل

(جس میں ہیرو ہیروئن کی شادی طے ہو جاتی ہے مگر ــــــ)

"آپ کو ماتا جی نے ملنے کے لئے بلایا ہے"۔ اندرا نے کسی قدر شرما کر کندن سے کہا۔

"کیوں کوئی خاص بات ہے؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم"۔

شام کو اسٹرائک کمیٹی کی میٹنگ تھی جس میں طے ہوا کہ چار دن بعد یعنی اگلے سوموار سے ہر اسٹوڈیو میں اسٹرائک کر دیا جائے گا۔ اس سے فراغت

پا کر کندن اندرا کے گھر پہنچا۔ اب یہ تاریک گلی اس کے لئے غیر معروف نہ رہی تھی۔ اندھیرے میں بھی وہ راستہ تلاش کر سکتا تھا۔ آج وہاں سے گزرتے ہوئے اس نے سوچا۔ چند مہینے پہلے کیا معلوم تھا کہ میرے رومانی خوابوں کی تعبیر ایسے ماحول میں پائی جائے گی۔ کہاں نازنین کا میرین ڈرائیو والا محل نما مکان اور کہاں اندرا کی کال کوٹھڑی! مگر عجیب بات یہ تھی کہ پھر بھی کندن کو کوئی افسوس نہ تھا۔ اس کی زندگی میں، اس کے جذبات اور محسوسات میں، اس کی امیدوں اور آرزوؤں میں اندرا اس طرح سما گئی تھی کہ اس کے بغیر رہنا اور کام کرنا کندن کو ناممکن نہیں تو مشکل اور بے مزا ضرور معلوم ہوتا تھا۔

اندرا اور اس کی ماں انتظار کر رہی تھیں۔ گڑ کی چائے تیار تھی، چائے پی کر کندن نے پوچھا "کیوں ماتا جی کیا بات ہے؟" اندرا کی ماں نے بیٹی کی طرف دیکھا۔ پھر کمرے کے چاروں طرف نظر ڈالی۔ مگر کوئی جگہ ایسی نہ پائی جہاں اندرا جا کر بیٹھ جائے تاکہ اس کی ماں وہ بات کندن سے کر سکے جو ہندستانی گھرانوں میں بیٹی کی موجودگی میں نہیں کی جاتی۔ اندرا خود اٹھ کر کونے میں چلی گئی جہاں دال کی ہنڈیا چولھے پر چڑھی ہوئی تھی اور بے ضرورت ڈوئی چلانے لگی حالانکہ اس کے شرم سے تمتمائے ہوئے کان ماں اور کندن کی طرف ہی لگے ہوئے تھے۔

"بیٹا، شرم آتی ہے تم سے یہ بات اس طرح کرتے ہوئے"۔ اندرا کی ماں نے بات کرنی شروع کی "مگر کیا کریں۔ حالت ایسی ہے کہ کہنا ہی

پڑتا ہے"

"کہو، ماتاجی، جو کہنا ہے مجھے گھر کا آدمی ہی سمجھو"

"بیٹا تم تو فلم کمپنی کا حال مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ سنا ہے وہ ایکٹرس جو ہے نازنین، اس نے زہر کھا لیا تھا"

"ہاں مگر ڈاکٹروں نے اُسے بچا لیا ہے۔ تین چار مہینے میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی"

"یہی میں نے بھی سنا ہے۔ اندرا کہتی ہے کہ سیٹھ نازنین کی جگہ کسی دوسری ایکٹرس کی تلاش کر رہا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو، اندرا وہ کام کر سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں۔ میک اپ کے بعد اندرا بھی نازنین جیسی خوبصورت نظر آئے گی۔ اور سمجھ بوجھ اندرا میں زیادہ ہے اس لئے بہت جلد ایکٹنگ سیکھ سکتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سیٹھ کسی نئی لڑکی کو ہیروئن کا پارٹ نہیں دے گا"

"مگر سیٹھ تیار ہے"

کندن کو یقین نہ آیا۔ ناممکن ہے کہ سیٹھ سونا مل چاندی والا ایک مشہور اسٹار کا پارٹ ایک گمنام لڑکی کو دے دے۔ "تم سے کس نے کہا ماں؟"

"وہ دادا گنجا ہے نا۔ وہ آیا تھا اندرا کے باپ کے پاس۔ کہنے لگا سیٹھ نے اندرا کو دیکھا ہے اور اسے اپنی نئی فلم میں نازنین کی جگہ ہیروئن کا پارٹ دینے کو تیار ہے ..."

دادا گنجا کا نام سن کر کندن کا ماتھا ٹھنکا۔ مگر یہ خبر اتنی شاندار اور سنسنی خیز تھی کہ چند لمحوں کے لئے وہ اس ذلیل اکسٹرا سپلائر اور اس کی رکیک چالوں کو بھول گیا " یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، ماں۔ اندرا سٹار بن جائے گی، ہزاروں روپے ماہوار کمائے گی "

" نہیں، بیٹا، شریفوں کے لئے یہ مر جانے والی بات ہے۔ سیٹھ اندرا کو یوں ہی پارٹ نہیں دے گا۔ دادا گنجا تو صاف کہہ گیا ہے کہ یہ پارٹ لینا ہے تو اندرا کو سیٹھ کی ... "

" ماں! "

" ہاں بیٹا۔ تم فلم کمپنی میں کام کرتے ہو مگر خود شریف ہو اس لئے ان سیٹھوں کے ہتھکنڈوں کو نہیں سمجھتے۔ مرنا تو اس کا ہے کہ اندرا کے باپ نے دادا گنجا سے وعدہ کر لیا ہے۔ اور اندرا کہتی ہے میں زہر کھا لوں گی پر اپنی عزت نہ بیچوں گی "

کندن کی نگاہ اس کونے کی طرف گئی جہاں اندرا چولھے کے پاس بیٹھی تھی۔ آگ کی روشنی میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ وہ شرم سے سر جھکائے تھی اور شاید اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کندن کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک شرابی باپ اور ایک غریب مدقوق ماں کی بیٹی اندرا نہیں بلکہ سیتا تھی، ساوتری تھی، دمینتی تھی —— ہندستانی عورت کی عفت وعصمت کی مقدس روح تھی۔ وہ ہرگز اس کے قابل نہیں تھا۔

" تو بیٹا اب اندرا کی لاج تمہارے ہی ہاتھ ہے۔ میں نے تو جس دن

تمھیں پہلی بار دیکھا تھا اُسی دن بیٹا بنا لیا تھا۔ اندرا نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا ہے پر میں جانتی ہوں وہ بھی تمھیں پسند کرتی ہے۔ اگر تم اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ لے لو تو میں اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں"

شادی کی تجویز! پریم بندھن! بیاہ! گرہستی! دو دل ایک ہو جائیں گے! لیکن اس وقت کندن کے دماغ میں اس تجویز کا کوئی رومانی پہلو نہ آیا۔ روپے آنے پائی کا مسئلہ سامنے آن کھڑا ہوا۔

تیس روپے ماہوار۔ بمبئی میں مکان عنقا۔ میاں بیوی رہیں تو کہاں۔ "پگڑی" کی رقم کہاں سے آئے؟ اسٹوڈیو میں اسٹرائک۔ شاید تیس روپے ماہوار بھی نہ ملیں۔ بے کاری۔ بھوک۔ بیوی۔ بچے ... کسی صورت سے ایک رومانی تصویر بنتی نظر نہ آتی تھی۔

"مگر ماں میری کوئی آمدنی نہیں ہے ..." اس نے کہنا شروع کیا "اندرا کو تکلیف ہوگی"

"بیٹا۔ لاج بیچنے سے زیادہ عورت کو اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی" کندن لاجواب ہو گیا۔

"اچھا، ماں، میں کل جواب دونگا۔ پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میری حالت بہتر ہوتی تو یہ بات میں خود کہتا۔ میں اسی لئے چپ تھا کہ آمدنی کی کوئی صورت ہو جائے تو کہوں گا۔ اب تم نے بات کی ہے تو میں کوئی نہ کوئی راستہ نکالوں گا"

اٹھتے ہوئے اس کی نگاہ ایک بار پھر اندرا پر پڑی جو ابھی تک چولھے کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ پلّو سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اور شعلوں کی پرچھائیں اس کی آنکھوں

امید بن کر چمک رہی تھی۔ آج وہ اسے چھوڑنے اور چراغ دکھانے زینے تک نہ آئی اور پھر بھی کندن کو یہ اچھا لگا۔ آج وہ دلہن بن گئی تھی۔

اُس رات اسے نیند نہ آئی۔ اُس رات اس نے اسٹرائک کے بارے میں بھی نہیں سوچا۔ پلنگ پر لیٹا وہ اندرا کا تصور کرتا رہا۔ اندرا۔ سمجھ دار اندرا۔ نرم و نازک اندرا۔ مہربان اندرا۔ محبت کرنے والی اندرا۔ محبت کرنے کے قابل اندرا۔ ایک ذہین دماغ۔ ایک ہمدرد دل۔ ایک دل پسند جسم۔ کتنی آرزوؤں اور حسرتوں کا گہوارہ۔

اور صبح جب وہ اسٹوڈیو گیا تب بھی وہ اسٹرائک کے بارے میں نہیں اندرا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہیں سے اسے ہزار دو ہزار روپے مل جائیں۔ کوئی اسے سو دو سو روپے کی نوکری ہی دے دے۔ تو وہ فوراً اندرا کو بیاہ کر گھر لے آئے۔ اس کی اندھیری زندگی میں اجالا ہو جائے۔ مگر کہاں سے اور کون؟

سروپ نے پوچھا "آج اسٹرائک کمیٹی کا جلسہ کے بجے ہے" اور کندن نے غیر حاضر دماغ سے جواب دیا "ہاں ہے تو شاید"

مرزا نے کہا "پر کاش ہو آنا چاہئے۔ سنا ہے وہاں کے کام کرنے والے اسٹرائک کے بارے میں ڈھل مل ہو رہے ہیں"۔ کندن نے غیر ضروری ترشی سے جواب دیا "تو کیا میرے ہی سر پر سب کام کی ذمہ داری ہے۔ تم لوگ کیوں نہیں ہو آتے؟"

رام ملاوس نے کہا "دیکھو، کندن، ذرا خبردار رہنا۔ ہمارے اسٹوڈیو

ہی میں سیٹھ کا پانچواں دستہ کام کر رہا ہے۔ اسٹرانگ کو ناکام کرانے میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔"

کندن نے جواب دیا۔ "کیوں خواہ مخواہ گھبرائے جاتے ہو۔ میں دیکھ لونگا۔"
مگر اس کی توجہ کہیں اور تھی، اُس نے یہ سنا ہی نہیں تھا کہ رام نے کیا کہا۔

اُس دن اندرا اسٹوڈیو میں نظر نہ آئی اور کندن کو کوئی تعجب نہ ہوا۔ آج وہ گھر سے نہ نکلے گی۔ جب تک وہ جواب لے کر نہ جائے گا وہ گھر بیٹھی رہے گی۔

ساڑھے دس بجے سیٹھ آیا۔ کندن سے کہا۔ "ڈائرکٹر باسو کو بلاؤ۔" کندن روز انتظار کرتا تھا کہ کب سیٹھ اس سے اسٹرانگ کے بارے میں کچھ کہے گا۔ بُرا بھلا کہے گا۔ گالیاں دے گا۔ شاید مارے پیٹے۔ اسٹوڈیو سے نکال دے۔ مگر سیٹھ نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ کئی گھنٹے تک بند کمرے میں باسو سے مسکوٹ ہوتی رہی۔ کندن جانتا تھا کہ وہ "سرخ سویرا" کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں کہ نازنین کی جگہ کون سی ہیروئن لی جائے اور دادا گنجا کی گندی تجویز کا خیال کر کے کندن کا چہرہ غصے اور شرم کے مارے سرخ ہو گیا۔

ایک بجے سے کچھ پہلے باسو نکل کر اپنے کمرے میں گیا۔ گھنٹی بجی اور کندن سیٹھ کے کمرے میں داخل ہوا۔

"کندن!"

"جی سیٹھ صاحب"

"بیٹھ جا"

کندن بیٹھ گیا۔ اب سیٹھ اسٹرائک کے بارے میں کچھ کہے گا۔ کندن بھی تیار تھا۔ "تم سیٹھ لوگ اپنی پروڈیوسرز ایسوسی ایشن بنا سکتے ہو تو ہم مزدور بھی اپنی یونین بنائیں گے۔ تم ہمارا خون چوستے ہو۔ ہماری محنت سے لاکھوں کروڑوں بناتے ہو اور ہمیں چاندی کے چند ٹکڑے دیتے ہوئے تمھیں موت آتی ہے۔ ہم نہتے ہیں، کمزور ہیں، مفلس ہیں۔ مگر اتحاد میں ہماری قوت ہے اسٹرائک ہمارا اعلانِ جنگ ہے"۔ کندن نے اپنی تقریر سوچ رکھی تھی۔

مگر سیٹھ نے اسٹرائک کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ ایک لفظ نہیں

"کندن!"

"جی سیٹھ صاحب"

"کہاں تک پڑھا ہے"

"میٹرک تک"

"انگریزی آتی ہے"

"آتی ہے جی مگر زیادہ نہیں"

"سیٹ پر کنٹینوئی ٹی لکھ سکتا ہے؟"

"ایک دو دن میں سیکھ سکتا ہوں"۔ مگر یہ سب سوال کیوں؟ کندن کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"باسو صاحب کو ایک اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔

"جی؟"

"میرے خیال میں تم کام کر سکتے ہو"

"جی۔ پوری کوشش کروں گا"

"ہمیں ایسے ہی نوجوان چاہئیں۔ جو محنت کریں اور کسی گڑبڑ میں پارٹ نہ لیں"۔

کندن چند لمحوں کے لئے "گڑبڑ" کا مطلب نہ سمجھا۔

"تنخواہ ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہو گی"

اسسٹنٹ ڈائرکٹر! ڈیڑھ سو روپے ماہوار! اب وہ اندرا سے شادی کر سکے گا۔ کندن کی آنکھوں کے سامنے رنگین نظارے گھومنے لگے۔

"پرسوں سوموار سے کام شروع ہو جائے گا"

"بہت اچھا"

"اب تم جا سکتے ہو۔ کل سے تم چپراسی نہیں ہو۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہو۔"

کندن دفتر سے باہر نکلا تو اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے عمر بھر کی امیدیں آرزوئیں ایک بار ہی پوری ہو گئی ہوں۔ وہ مسرت کی فضا میں اڑ رہا تھا۔ مگر دفعتاً وہ دھماکے کے ساتھ زمین پر آرہا۔

منگو، ایک اسٹینگ قلی نے آکر کہا "کندن بابو۔ رات کو نو بجے میٹنگ ہے اسٹرائیک کمیٹی کی۔ رام صاحب نے کہا تھا آپ سے کہدوں"

اسٹرائک!

اسٹرائک کو تو وہ بھول ہی گیا تھا!

اب اُس کی سمجھ میں آیا کہ "گڑبڑ" سے سیٹھ کا کیا مطلب تھا۔

اب اُسے معلوم ہوا کہ ایک سابق لائٹ قلی اور حال چپراسی کو یک لخت اسسٹنٹ ڈائرکٹر کیوں بنایا جا رہا تھا۔

اب اُسے یاد آیا کہ وہ ابھی ابھی ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر اپنا ضمیر بیچ آیا تھا۔

اب اس کی سمجھ میں آیا کہ سیٹھ نے سوموار سے کام کرنے کو کیوں کہا ہے!

اُس کا جی چاہا فوراً واپس جا کر سیٹھ کی ذلیل رشوت اُس کے منہ پر دے مارے۔ کیا وہ سمجھتا ہے وہ ایک خوددار مزدور کی عزت چاندی کے ٹکڑوں سے خرید سکتا ہے۔

مگر اُس کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ اندرا! اگر اُس نے سیٹھ سے لڑائی کر لی تو پھر اندرا سے شادی کیسے کر سکے گا؟ نوکری، روپے، شادی مسرت ہر چیز کا دار و مدار سیٹھ کی خوشنودی پر تھا۔

اُس نے منگو سے کہا۔

"کہہ دینا مجھے رات کو کام ہے۔ میں میٹنگ میں نہ آسکوں گا"

وہ اسٹوڈیو سے باہر نکل کر ٹرام اسٹیشن کی طرف چلا۔

دور سے اُس نے رام اور مرزا کو باتیں کرتے ہوئے آتے دیکھا اور پان والے کی دکان کے برابر میں دبک گیا تاکہ وہ اسے نہ دیکھ پائیں۔ جب وہ گزر گئے تو وہ نکلا۔ اور جیب تک ٹرام میں سوار نہ ہو گیا دھڑکتے ہوئے دل سے اِدھر اُدھر مڑ مڑ کر دیکھتا رہا ... جیسے چور

---

# گیارھواں ریل

(جس میں آخر کار ہیرو اور ہیروئن مل جاتے ہیں
—— ہمیشہ ہمیشہ کے لئے)

سوموار

آج گریٹ آرٹ پکچرز کے تازہ ترین شاہکار "سُرخ سویرا" کی مہورت تھی۔ پروہت نے ستاروں سے دریافت کر کے دس بج کر ۲۹ منٹ کا وقت مقرر کیا تھا۔

اسٹوڈیو میں چہل پہل تھی۔ کیمرے پر ہار پھول چڑھے ہوئے تھے

سیٹ پر ایک کونے میں برہمن بیٹھے پوجا کر رہے تھے۔ سیٹھ صاحب شارک سکن کا کوٹ پہنے ماتھے پر چندن لگائے خوش خوش گھوم رہے تھے۔ ڈائرکٹر باسو کے تمام دانت باہر نکلے پڑ رہے تھے۔ اور سب سے زیادہ خوش کندن تھا۔ آج وہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھا۔ چند سال میں ڈائرکٹر ہو گا۔

مگر اسٹوڈیو میں بعض چہرے مغموم بھی تھے۔ بڑھئی، قلی، میک اپ کرنے والے۔ اور چند جانے بوجھے چہرے غائب بھی تھے۔ رام اور چوڑہ کو نکال دیا گیا تھا۔ مرزا اور سروپ کا داخلہ بند کر دیا گیا تھا۔ اسٹرائک فیل ہو گیا تھا۔ کندن کے استعفیٰ کے بعد یونین کے کتنے ہی ممبروں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اتحاد کی عمارت اڑاڑا دھم کر کے گر پڑی تھی۔ مالکوں کی فتح ہوئی تھی اور مزدوروں کی شکست۔

کندن خوشی خوشی مہورت کا انتظام کر رہا تھا۔ یہاں سے فراغت پاتے ہی وہ اندرا کے ہاں جائے گا۔ اُسے مہورت کے پیڑے کھلائے گا۔ آج نہ صرف "سرخ سویرا" کی مہورت تھی بلکہ کندن کی نئی زندگی کا بھی افتتاح تھا۔ آج وہ ماں سے بیاہ کی تاریخ مقرر کرائے گا۔ اور پھر وہ اور اندرا دو سے ایک ہو جائیں گے۔ خوشی کے اس لمحے میں اُسے دادا گنجا کا گھناؤنا چہرا نہایت نامبارک معلوم ہوا۔ یہ کم بخت آج کیوں ٹپک پڑا تھا مگر دادا اس شان سے اسٹوڈیو میں پھر رہا تھا۔ جیسے آج کا ہیرو وہ ہی ہو سیٹھ کو کونے میں لے جا کر نہایت بے تکلفی سے باتیں کیں اور پھر ساتھ لے کر سیٹھ کے پرائیویٹ دروازے سے اس کے دفتر میں چلا گیا۔

جتنے لوگ موجود تھے سب کی زبان پر ایک ہی مضمون تھا۔ سیٹھ صاحب نے ہیروئن کون سی منتخب کی ہے۔ سنا تھا کوئی بالکل "نیا چہرہ" ہے کوئی کہتا ایک بڑے گھرانے کی "سوسائٹی گرل" ہے۔ کسی کا بیان تھا ایک رجواڑے کی شہزادی ہے۔ دو چار کا خیال تھا نازنین اب اچھی ہوگئی ہے اور ڈرامائی انداز میں آخری لمحے پر مہورت کے لئے آجائے گی۔ سیٹھ صاحب نے اپنے سکریٹری تک کو اس راز میں شریک نہ کیا تھا۔

مہورت کے وقت میں پندرہ منٹ رہ گئے۔ برہمن اشلوک زور زور سے پڑھنے لگے۔ اتنے میں دروازے کے قریب کچھ شور ہوا تو کندن اُدھر بھاگا۔ وہاں دیکھا کہ نرمل کو تین چار آدمی پکڑے ہوئے ہیں اور وہ اُن سے اکیلا لڑ رہا ہے۔ باغی ادیب کی حالت عجیب تھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی۔ آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی، جیسے وہ نشہ میں ہو یا روتا رہا ہو، اور وہ چلّا رہا تھا "یہ فلم نہیں بنے گا۔ میں اپنے نام کو چاندی کے ٹکڑوں کے عوض نہیں بیچوں گا۔ یہ میری کہانی نہیں ہے۔ یہ میری کہانی نہیں ہے۔ سُرخ سویرا مزدوروں کے خون کی شفق ہے، سرمایہ داری کے گھناؤنے چہرے کا غازہ نہیں ہے"۔

"بیچارہ پاگل ہوگیا ہے" کندن نے سوچا اور اُسے بچانے کی غرض سے آگے بڑھا۔ مگر ڈائرکٹر باسو اُس سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔

"اے نرمل بابو یہ کیا گول مال ہے"

"خونی۔ تو نے ہی میری کہانی کا قتل کیا ہے۔ میرے خیالات اور